مسلمانوں کی معاشی بہتری کی راہیں
ڈاکٹر سید ابوذر کمال الدین

نام کتاب

مسلمانوں کی معاشی بہتری کی راہیں

مصنّف:

ڈاکٹر ابوذر کمال الدین

صفحات: ۸۸　　قیمت: -/۲۵ روپے

طبع اوّل: ستمبر ۲۰۰۴ء

باهتمام
محمد ناصر خان

ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول ﷺ اور دینی و دیگر علمی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور طباعت سے قبل کوشش کی جاتی ہے کہ نشاندہی کی جانے والی جملہ غلطیوں کی بروقت تصحیح کر دی جائے۔ اس کے باوجود غلطیوں کا امکان باقی رہتا ہے۔

لہٰذا قارئین کرام سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ علمی غلطیوں کی نشاندہی کریں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں تعاون کرنا صدقہ جاریہ کے مترادف ہے۔ (ادارہ)

Name of the book

Musalmano Ki Ma'ashi Behtari Ki R'ahein

Author: **Dr. Abu Zar Kamaluddin**

Ist Edition: September, 2004

Pages: 88　　Price: **Rs. 25/-**　　Size: 23x36/16

Laser Typesetted by: **Abdul Tawwab**

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2
Phones: 23247075, 23289786, 23289159 Fax: 23279998 Res.: 23262486
E-mail: farid@ndf.vsnl.net.in Websites: faridexport.com, faridbook.com

Printed at: **Farid Enterprises**, Delhi-6

ترتیبِ مضامین

❐ ❐ ❐

عرض مصنف

کتاب لکھنا بعض لوگوں کا ذریعہ معاش ہے تو بعض لوگوں کے لئے اپنی علمیت کے اظہار کا ذریعہ اور بعض اسے ترسیل افکار کا وسیلہ مانتے ہیں تو بعض کے نزدیک وقت گذاری کا مشغلہ۔ میں اسے کیا نام دوں مجھے معلوم نہیں ہے۔ شاید میرا مقصد دل کے ہرے زخموں کو دکھا کر اس پر پھایا رکھنے کی کوشش ہے۔

کتاب لکھنے کے لئے بڑی علمی صلاحیت چاہئے۔ زبان و بیان پر پوری قدرت درکار ہے۔ اس کے لئے ایک نکتہ سنج اور دقیق رس ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلوب اور انداز کا مناسب ہونا اس کے چند ضروری لوازم ہیں۔ لیکن ایک ایسا شخص قلم و قرطاس لے کر بیٹھا ہے جس کے پاس ایک حساس اور دردمند دل کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے جسے لوگوں کے سامنے پیش کر سکے۔

آپ کے ہاتھ میں اس وقت جو کتاب ہے اس کے مصنف کو اس کے علاوہ کوئی دعویٰ نہیں ہے کہ اس نے اپنے ایماندارانہ احساس کو الفاظ کا جامہ پہنا کر آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ میرے اس احساس میں کتنی سچائی ہے، حالات و واقعات کا تجزیہ کتنا درست ہے، مسائل و معاملات کا ادراک کس حد تک صحیح ہے اور خطوط کار کا تعین کتنا مناسب ہے، میں اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ ممکن ہے تحریر و بیان میں کہیں سقم ہو، فہم میں کوئی جھول رہ گیا ہو یا کسی تجزیہ سے آپ کو اتفاق نہ ہو۔ تاہم ان باتوں کو ردو قبول کرتے وقت اس پر ضرور توجہ دیں گے کہ ہم کون ہیں ہماری یافت اور شناخت کیسے باقی رہے گی اور ہم کیسے آگے بڑھ سکتے ہیں؟ کتاب کوئی روڈ میپ نہیں ہے بلکہ صرف ایک اشارہ ہے۔

میں حضور حق سے ایک رجائی فطرت لے کر پیدا ہوا ہوں۔ حالات کی سختی سے گھبرا ضرور جاتا ہوں مگر مایوس کبھی نہیں ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ دنیا جائے عمل ہے۔ محض آرزوؤں اور خواہشات

سے کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ کا واضح اعلان ہے بلا شبہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا کوشش کے بغیر کبھی کوئی کامیابی نہیں ملتی ہے۔ ملت کی تعمیر و ترقی، صلاح و فلاح، قوت و بہتری کوشش پر موقوف ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں ہم ضرور ان کو اپنا راستہ دکھا دیتے ہیں۔ اور قوموں کی بہتری اور ابتری کے باب میں قرآن کا اعلان ہے کہ "اللہ نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی جو خود اپنی حالت بدلنے کو تیار نہ ہو"۔ تو پھر ہم کیوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ ہماری مدد غیب سے اُسی وقت ہوگی اور ہم وقت کے دجّال کو اُسی وقت مار بھگا سکتے ہیں جب ہم علم و ایمان سے آراستہ ہو کر اخلاق و اتحاد کے ساتھ خدمت اور خوبی پر مبنی ایک بھرپور جدوجہد کا آغاز کریں۔ یہ کتاب اسی مقصد سے لکھی گئی ہے۔

اللہ سے دعاء ہے کہ اللہ اس کتاب کے مندرجات کو قبول فرمائے اور اہل اسلام اور انسانیت کی بہتری کا ذریعہ بنائے۔

ادارہ **فرید بک ڈپو** جس کے زیر اہتمام یہ کتاب شائع کی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ اس کو مزید عروج و بلندی عطاء کرے۔ (آمین)

ـــــ ڈاکٹر ابوذر کمال الدین

عرض ناشر

ڈاکٹر ابوذر کمال الدین بہار کے ایک سنجیدہ مسلمان دانشور ہیں جو طالب علمی کے زمانے سے ہی اپنی صالح اور تعمیری فکر کی وجہ سے مشہور رہے ہیں۔ وہ ایک صالح صحت مند تعلیم یافتہ، متحد اور مضبوط اسلامی معاشرے کی تعمیر کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں اور ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے ہر عملی کوشش کے حصہ دار ہیں۔ موصوف ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ قرآن پاک، سیرت، تاریخ، معاشیات، ادب اور سیاست ان کی دلچسپی کے میدان ہیں۔ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے تقریر و تحریر دونوں پر یکساں قدرت عطا کی ہے اور وہ اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں بولتے اور لکھتے ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں ان کی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ہندی میں ان کی کتاب "حضرت محمدؐ اور بھارتیہ سماج" سیرت کے موضوع پر ایک انوکھی کتاب ہے جس میں سیرت کے حوالے سے اسلام کا پورا تعارف اور ہندوستانی تناظر میں حضورؐ کی سیرت کی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کو کافی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

ڈاکٹر ابوذر کمال الدین نے بہار یونیورسٹی، مظفر پور سے معاشیات میں امتیازی حیثیت سے پوسٹ گریجویٹ کیا اور بہار یونیورسیٹی سے ہی بلا سودی بینک کاری پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ وہ ملک و بیرون ملک مختلف سمینار میں شریک ہوئے۔ 1986ء میں WAMY کی دعوت پر سعودی عرب (ریاض) گئے اور اس کے زیر اہتمام منعقدہ عالمی سمینار میں ہندوستانی مسلمانوں کے معاشی مسائل پر اپنا گرانقدر مقالہ پیش کیا جو کئی ملکی اور غیر ملکی اخبارات و رسائل میں شائع ہوا۔ 1990ء میں ریسرچ کے سلسلے میں انگلینڈ کا سفر شروع کیا اور وہاں متعدد اسلامی معاشیات کے ماہرین سے ملاقات و استفادہ کیا۔ موصوف بہار یونیورسیٹی کے ایک معروف Constituent College میں سولہ سال تک معاشیات کے استاد رہے۔ پھر ان کا تبادلہ یونیورسٹی کے پوسٹ

[illegible]ٹ ڈپارٹمنٹ میں ہوگیا۔اس کے بعد یونیورسٹی سروس کمیشن سے پرنسپل مقرر ہوئے۔ بہار یونیورسٹی کے تین معروف سرکاری کالجوں میں پرنسپل کے عہدہ پر فائز رہے۔ان دنوں بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کونسل پٹنہ میں وائس چیرمین ہیں۔

ڈاکٹر ابوذر کمال الدین ایک ایسے دانشور ہیں جن کو بجا طور پر دانشور کارکن (Intellectual Activist) کہا جاسکتا ہے۔مسلمان بچوں کی تعلیم اور خواتین و پسماندہ طبقوں کی تعلیم ان کا خاص عملی میدان ہے۔اس کے علاوہ وہ نفرت،تعصب،تشدد،ظلم اور حق تلفی سے پاک ایک ایسے پُرامن سماج کی تعمیر کے خواہاں ہیں جہاں سب کے ساتھ انصاف اور برابری کا سلوک ہوتا ہو۔ اپنی انہیں خوبیوں کی وجہ سے وہ ہر طبقے کے عوام و خواص، علماء و دانشورں کے درمیان مقبول ہیں۔ڈاکٹر صاحب موصوف بہار کے ایک ایسے مسلمان دانشور ہیں جو غیر مسلموں کی مجلس میں بغیر کسی مداہنت کے نہ صرف اسلام کا دفاع کرتے ہیں بلکہ پُرزور وکالت کرتے ہیں، اور ان کی باتیں بہت غور و توجہ سے سنی جاتی ہیں۔انہوں نے غیر مسلموں میں تعارف اسلام کا بھی کام کیا ہے۔اور وہ صحیح علم پر مبنی قومی یکجہتی کے زبردست وکیل ہیں۔انہیں ہندو مائیتھولوجی سے بھی گہری دلچسپی ہے اور حسب موقع مشترکہ بنیادی انسانی اقدار کے فروغ میں اس سے مدد بھی لیتے ہیں۔

موصوف ہندوستان میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کو ملی بقاء اور استحکام و ترقی کی لازمی شرط مانتے ہیں اور ذاتی اغراض کی قربانی کو ملی اتحاد کی ضمانت سمجھتے ہیں۔موصوف کا خیال ہے کہ دین و ملت کسی بھی فرد، جماعت، مسلک اور ادارے سے بڑی چیز ہے اس لئے اس کی [illegible] و حفاظت کے لئے ہر جذبہ اور احساس سے اوپر اٹھ کر آگے آنا چاہئے۔وہ انسانیت عامہ کی بالالحاظ مذہب و ملت خدمت کے مدعی ہیں۔اور مسلمانوں کو خیر امت کی حیثیت سے اس ملک اور [illegible]مان میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

[illegible]صوف علم معاشیات کے استاد اور طالب علم ہیں۔منطقی اور استدلالی ذہن رکھتے ہیں۔اپنی [illegible] وضاحت اور صفائی سے رکھتے ہیں۔زبان سادہ اور پُر اثر ہے۔روزمرہ کے محاورات اور [illegible] تے ہیں۔اور اپنی بات کہنے کے لئے راست انداز اختیار کرتے ہیں۔

زیر نظر کتاب ''مسلمانوں کی معاشی بہتری کی راہیں'' فاضل مصنف کی گذشتہ تین کتابوں ''امت مسلمہ کا مستقبل۔ہدف، چیلنج اور ترجیحات'' اور ''مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب اور اس کا حل'' اور ''تعمیر ملت کی راہیں'' ایک مرکزی فکر ـــــ تعمیر ملت کی وضاحت اور اس کی تشریح ہے۔دراصل چاروں کتابیں ایک خاص ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہیں جس کی ہر کڑی دوسرے سے مربوط ہے۔لہٰذا ان چاروں کتابوں کو ملت نامہ حصہ اوّل، حصہ دوم، حصہ سوم اور حصہ چہارم کے طور پر دیکھنا چاہئے اور پوری بحث کو سمجھنے اور اس سے تعمیری نتیجہ اخذ کرنے کے لئے اسی ترتیب سے پڑھنا چاہئے۔ان کتابوں کو مصنف کی علمی کاوش کے بجائے ایک دردمند دل کی پکار کے طور پر دیکھنا زیادہ صحیح ہوگا۔ان کتابوں میں مصنف نے دردمندی کے ساتھ امت کے افراد کو کچھ کرنے کی طرف آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔توقع ہے کہ ان کتابوں کو اور بالخصوص زیر نظر کتاب کو ملت کے ہر فرد اور طبقہ کی طرف سے بھرپور پذیرائی ملے گی۔اللہ سے دعاء ہے کہ یہ کتاب ملت کے حق میں رحمت ثابت ہو اور اس سے اتحاد و تعمیر نیز معاشی بہتری کے نئے دور کا آغاز ہو اور فاضل مصنف اور ناشر کو اس کا بہترین اجر ملے۔آمین

ـــــ محمد ناصر خاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

یہ ایک ٹھوس زمینی حقیقت ہے کہ ہندوستانی مسلمان چاہے وہ شمال کا ہو یا جنوب کا پورب کا ہو یا پچھّم کا معاشی لحاظ سے ملک کی پس ماندہ ترین آبادی ہے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی معاشی محرومی بڑھتی ہی جارہی ہے۔ میری نظر میں اس کے چار بڑے عوامل ہیں۔ ایک تاریخی، دوسرا مذہبی، تیسرا سیاسی اور چوتھا ملی۔ مسلمانوں کی معاشی محرومی کا سلسلہ انگریزوں کے ہندوستان پر قبضہ سے ہی شروع ہوجاتا ہے۔ انگریزوں کی آمد سے قبل کم و بیش پورے ہندوستان پر مسلمانوں کا ہی قبضہ تھا۔ صاحب اقتدار، صاحب قوت ہونے کے ناطے ملک کی معیشت کی کنجی بھی انہی کے ہاتھوں میں تھی۔ زراعت، صنعت، تجارت، سرکاری عہدوں اور منصب میں ان کی بالادستی کی وجہ سے ان کی معاشی حالت ملک کے دیگر طبقات کے مقابلے بہتر تھی۔ دراصل یہ لوگ ملک کی کارساز قوت تھے لہٰذا ان کی معاشی فارغ البالی تھی۔ لیکن جیسے ہی انگریزوں کا قبضہ ہوا انہوں نے مسلمانوں کو کمزور، منتشر اور بے وزن بنانے کی اسکیم رچی اور ایسی سیاسی، معاشی اور تعلیمی پالیسی وضع کی جس سے مسلمان دن بدن پچھڑتے چلے گئے اور معاش کے ہر میدان میں شکست و ریخت سے دوچار ہونے لگے۔

جنگ آزادی اپنی جلو میں ہندو مسلم کش مکش لے آئی جس نے ملک کو آزاد تو کرایا لیکن دونوں قوموں کے درمیان ایک زبردست دراڑ پیدا ہوگئی اور ملک کا بٹوارہ ہوگیا۔ مسلمانوں میں جو ذرا بھی بہتر تھا وہ پاکستان چلا گیا۔ پڑھے لکھے لوگوں کا ایک بہت ہی چھوٹا سا طبقہ ہندوستان میں رہ گیا۔ فسادات اور امتیازات کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔ مسلمان سنبھل بھی نہیں پا رہے تھے کہ منھ کے بل گرتے چلے گئے جس نے ان کی معاشی کمر توڑ دی۔ آزادی کی چھ دہائیوں کے بعد بھی اس سیاہ رات کا سویرا بہت دور نظر آتا ہے۔ لہٰذا تاریخی طور پر مسلمان کم و بیش تین سو سالوں سے معاشی

پس ماندگی کے گرداب میں پھنسے ہیں۔ جہاں سے نکلنے کی اب تک کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔

مسلمانوں کی پس ماندگی کا دوسرا سبب مذہبی ہے۔ ان کے اندر دینی علم اور دینی تفقہ نا کے برابر ہے۔ وہ اسلام کی جامعیت سے ناواقف ہیں۔ بہت سے لوگ یہ جاننے اور ماننے کے باوجود کہ اسلام ایک مکمل دین ہے اس کا صحیح فہم و ادراک نہیں رکھتے۔ اسلام معاش اور معاد سے عبارت ہے۔ یہ حسنِ دنیا اور حسنِ آخرت دونوں کا طالب ہے۔ اسلام کی راہ اعتدال کی راہ ہے مگر راہِ مستقیم چھوٹ جانے سے ملت مختلف پگڈنڈیوں پر چل رہی ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے دنیا اور علائق دنیا کو بے قیمت سمجھ کر اسے بالکل چھوڑ رکھا ہے اور زمانے و حالات سے بے خبر اپنے تمدن اور معاش کی گاڑی کو اس انداز سے کھینچ رہا ہے گویا انہیں دنیا سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ جبکہ دوسرا گروہ دین و تقویٰ سے بے نیاز ہر کھیت میں منھ مارنے کو تیار ہے۔ اس کے نزدیک اس کے پاس سب سے بے وزن اور بے قیمت چیز اس کا دین و ایمان ہے جس کو وہ تھوڑی سی قیمت پر بغیر کسی جھجھک کے بیچنے کو تیار ہے۔ ظاہری بات ہے جہاں اتنا تضاد اور تفاوت ہوگا وہاں کسی معقول اور منطقی رویہ کے تحت زندگی گذارنا کتنا مشکل ہے۔ چنانچہ مسلمان سماج معاش کے بارے میں کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں رکھتا۔ معاش کے معاملہ میں صحیح دینی رہنمائی نہیں ہونے کی وجہ سے مسلمان عوام بالعموم اس سے ناواقف ہیں کہ اسلام نے حصول معاش پر کتنا زور دیا ہے اور اس کے کیا طریقے بتائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں جو معاشی جدوجہد ہو رہی ہے وہ دین و شریعت سے بالکل بے پرواہ ہوکر ہو رہی ہے بلکہ انہیں فتوے کے ذریعہ یہ تو بتایا گیا ہے کہ کیا چیز حرام اور ناجائز ہے مگر ان کو یہ نہیں معلوم کہ کیا حلال اور جائز ہے۔ ہر نظام کی اپنی فطرت ہوتی ہے۔ چونکہ موجودہ نظام غیر اسلامی ہے اس لئے یہاں حرام اور ناجائز کے مواقع کھلے ہوئے ہیں اور حلال اور جائز کے مواقع محدود ہیں۔ اس لئے مسئلہ یہ ہے کہ اس صورتحال میں صحیح معاشی نقطۂ نظر کیا ہونا چاہئے؟ اس کے لئے واضح خطوط پر مشتمل جامع معاشی رہنمائی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ہمارے واعظین اپنی تقریروں میں دنیا کو قید خانہ اور مردار سے زیادہ حقیر تو بتاتے ہیں لیکن وہ اس بات پر کم توجہ دیتے ہیں کہ جب تم نماز سے فارغ ہوجاؤ تو اللہ کی زمین میں پھیل جاؤ اور

اس کا فضل تلاش کرو۔ عبادت کے دس حصے ہیں جس میں نو حصوں کا تعلق رزق حلال کے حصول سے ہے۔ غربت آدمی کو کفر سے قریب تر کر دیتی ہے، اور زکوٰۃ اور حج جیسے فریضے کی ادائیگی بغیر حصول مال کے نہیں ہو سکتی۔ کسی حاجت مند کی ضرورت پوری کرنا رات بھر نماز پڑھنے اور دن بھر روزہ رکھنے سے بہتر ہے۔ لہٰذا ہمیں ان تعلیمات کو صحیح تناظر میں اور اعتدال کے ساتھ برتنے کی ضرورت ہے تاکہ ملت میں ایک صحیح متوازن معاشی نقطۂ نظر فروغ پا سکے۔ کیا ہماری دینی جماعتیں، دانشور حضرات اور علمائے کرام اس جانب توجہ دیں گے؟ اس وقت مسلمانوں کی بے وقعتی میں جو عناصر معاون ہو رہے ہیں ان میں ایک ان کی معاشی پستی بھی ہے۔ لہٰذا یہ ایک اہم دینی ملی فریضہ ہے جس کے لئے اجتماعی جدوجہد ہونی چاہئے۔

مسلمانوں کی معاشی پستی کا تیسرا سبب سیاسی ہے۔ جنگ آزادی کے دوران ہی بعض تاریخی اور سیاسی وجوہات سے ہندو مسلم کشمکش تیز ہوگئی۔ آزادی اپنی جلو میں بہت سارے زخم لے کر آئی۔ اس میں کون کتنا قصوروار ہے یہ ایک الگ موضوع ہے۔ بہر حال مسلمانوں کو خاص طور سے مجرم مانا گیا۔ دستور ہند نے ایک فرد اور ایک قوم کی حیثیت سے وہ سارے اختیارات اور تحفظات تو عطا کئے جس میں مسلمان ایک پر امن ماحول میں جی سکتے تھے اور اپنی بگڑی بنا سکتے تھے۔ مگر برا ہو یہاں کی سیاست کا جو بغیر مسلمانوں کے خون کے آگے چل ہی نہیں سکتی۔ ملک میں ایک گروہ ایسا ہے جس کا خیال ہے کہ جب ملک تقسیم ہو گیا تو اب اس ملک میں مسلمانوں کے رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لئے بہتر تو یہ ہے کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔ اور اگر ان کو رہنے کی اجازت دی بھی جاتی ہے تو انہیں یہاں کے دین و تہذیب، تمدن و ثقافت میں ضم ہونا ہوگا۔ دھونس، دھاندھلی اور خوف کا ماحول پیدا کر کے یہ طبقہ ملک کے مسلمانوں میں عدم استحکام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستان پر گذشتہ چالیس سال تک کانگریس کی حکومت رہی۔ کانگریس آزادی کے دنوں سے ہی ایک نظریاتی پارٹی کم اور ایک پلیٹ فارم زیادہ تھی جس میں اقتدار میں ہونے کی وجہ سے اس گروہ کے لوگ بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے جو آر ایس ایس اور ہندو مہاسبھا کے سے نظریات رکھتے تھے۔ چنانچہ جب وہ مرکز اور ریاست میں امیر اور وزیر بن گئے تو انہوں نے کبھی اعلانیہ اور

کبھی ڈھکے چھپے انداز سے ایسی پالیسی وضع کی اور ایسے طریق کار رائج کئے جس میں مسلمانوں کو نظر انداز کر کے ترقیاتی منصوبے بنائے گئے۔ اب اول الذکر گروہ کو ملک پر اقتدار حاصل ہو گیا ہے تو صورتحال اور بھی دھماکہ خیز ہوگئی ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

مسلمانوں کو نمائشی کاموں سے مطمئن رکھنے کی کوشش کی گئی اور کبھی ان کے واجبی مسئلہ کو ایڈریس نہیں کیا گیا۔ اس وقت ہندوستان میں دس پانچ سالہ منصوبے روبہ عمل لائے جا چکے ہیں۔ ان منصوبوں میں شیڈول کاسٹ، شیڈول ٹرائبس، او بی سیز، بیک ورڈ ایریا اور اس طرح کی چند دوسری چیزوں کے لئے الگ سے خصوصی منصوبے اور پیکیج تو ملتے ہیں لیکن مسلمانوں کی معاشی فلاح اور ترقی کے لئے جو موجودہ ہندوستان میں ملک کا سب سے پس ماندہ ترین طبقہ ہے اس کے لئے کوئی قابل ذکر منصوبہ نہیں ہے۔ الیکشنی ضرورت سے بعض پروگراموں کا ذکر ملتا ہے جیسے پندرہ نکاتی پروگرام وغیرہ۔ مگر اس کی حیثیت کاغذی ہے۔ اگر کبھی کوئی حکومت مسلمانوں کی فلاح، ترقی، تحفظ اور بہبود کے باب میں کوئی بیان اور اعلان کرتی ہے تو اسے فوراً منھ بھرائی قرار دے کر ایک دوسرا سیاسی محاذ کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ دوسری طرف ہر تھوڑے وقفہ پر کوئی بڑا فساد کرا کے ان کو تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے اور پورے ملک میں خوف کی نفسیات پیدا کر کے ان کو آگے بڑھنے سے روک دیا جاتا ہے۔ اسی دوہری اور دوغلی سیاست نے مسلمانوں کی معاشی کمر توڑ دی ہے اور مسلمان ہندوستانی اقوام کی معاشی دوڑ میں آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے چھوٹتے چلے جا رہے ہیں۔

مسلمانوں کی معاشی پستی کی چوتھی اور آخری وجہ ملی ہے۔ مسلمان ملت صرف حالات و سیاست کی ہی ماری نہیں ہے بلکہ یہ اپنی دشمن آپ بھی ہے۔ صرف دینی سمجھ کی ہی کمی نہیں ہے بلکہ ان کے اندر عصری آگہی کا بھی فقدان ہے۔

ہمارے علماء اور دانش وروں کی سمجھ میں ابھی تک یہ نہیں آیا ہے کہ ہم سولہویں اور سترہویں صدی میں نہیں بلکہ اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں۔ ہر عہد کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جو گذشتہ عہد سے مختلف ہوتے ہیں۔ اب نہ مسلم ہندوستان ہے اور نہ انگریزوں کی حکمرانی والا برٹش انڈیا

ہے بلکہ اب یہ مشترک ہندوستان ہے جہاں دستوری جمہوریت قائم ہے۔ لہٰذا ماضی کا کوئی مائنڈ سٹ اب اس چوکھٹے میں فٹ نہیں کرے گا۔ نیا عہد نئی سوچ کا متقاضی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ ہمارا سامنا ایک Hostile majority سے ہے لیکن ایک Resurgent قوم کی ساری علامتیں ہندوستان میں موجود ہیں۔ ہم اس قوم کا جزو لاینفک ہیں۔ لہٰذا اس کے Fortune میں ہمارا بھی پورا حصہ ہے۔ لیکن اپنے حق کے حصول کے لئے ہمارے اندر استحقاق ضروری ہے۔ اور یہ استحقاق دو طرح سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ایک انفرادی کوشش اور دوسرے اجتماعی منصوبہ بندی۔ ملت کو ایک کمیونیٹی پلان کی ضرورت ہے۔ یہ کمیونیٹی پلان ہمارا سیاسی ایجنڈا بھی ہونا چاہئے اور ہمارا معاشی ایجنڈا بھی۔ ہمیں اپنے وسائل، مردان کار اور دنیا بھر میں ہونے والے تجربات کا جائزہ لے کر ایک ٹائم بونڈ پروگرام بنانا چاہئے اور ایک مضبوط سیاسی ایجنڈے کے تحت حکومت کو بھی اس کے نفاذ میں مدد کے لئے آمادہ کرنا چاہئے۔

ملت کی لیڈر شپ کو اپنے دینی، تمدنی اور سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ تعلیم، معاش اور ترقیاتی امور کو بھی اپنے ایجنڈے میں شامل کرنا چاہئے اور اس کو اپنی سیاست کی بنیاد بنانا چاہئے۔ اس کے لئے جدوجہد کرنے تحریک چلانے، چوٹ کھانے اور جیل جانے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ جمہوری سیاست میں حصولِ مقصد کے جو بھی معروف طریقے رائج ہیں اُن کو بروئے کار لاکر اپنی معاشی بہتری کی کوشش وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کے لئے ملت کو تیار اور آمادہ کرنا ہماری ترجیحات میں شامل ہونا چاہئے۔ ایمان کی حفاظت کے لئے روٹی بہت ضروری ہے۔ اس لئے اقامت صلوٰۃ کی طرح اقامت معاش کی بھی جدوجہد ہونی ہی چاہئے۔ اقامت دین کے لئے اقامت ملت ایک ضروری شرط ہے اور معاشی بہتری سے دونوں کی اقامت میں مدد ملے گی۔

یہ کتابچہ **''مسلمانوں کی معاشی بہتری کی راہیں''** جو آپ کے ہاتھ میں ہے ایک محدود کینوس پر مسلمانوں کے معاش سے متعلق معاملات پر بحث کرتا ہے۔ اس کتابچہ میں اسلام میں معاش کی اہمیت، حصولِ معاش کے باب میں اسلامی تعلیمات، مسلمانوں کے معاشی مسائل اور معاشی بہتری کی راہیں جیسے بنیادی موضوعات پر مختصر مگر جامع انداز سے گفتگو کی گئی ہے جس کو نشانِ راہ

کے طور پر دیکھا جانا چاہئے۔

اللہ سے دعاء ہے کہ زبان و بیان میں ہوئی بے اعتدالیوں کے شر سے محفوظ رکھے اور ملت کے لئے اس کتابچہ کو مفید بنائے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان ایسے باصلاحیت افراد پیدا کرے جو ملی اتحاد و استحکام کے لئے واضح رہنمائی کرسکیں۔ (آمین)

—— ڈاکٹر ابوذر کمال الدین

باب اول

اسلام میں معاشی جدو جہد کی اہمیت

ایک کہانی۔بچپن میں کسی کتاب میں ایک کہانی پڑھی تھی کہ ایک شخص کا گذر ایک جنگل سے ہوا۔اس نے ایک جھاڑی میں ایک اپاہج لومڑی کو پایا۔اسے تجسس ہوا کہ یہ لومڑی تو اپاہج ہے آخر یہ اپنا رزق کیسے حاصل کرتی ہوگی؟ ابھی وہ اسی خیال میں غلطاں و پیچاں تھا کہ دفعتاً اس نے ایک شیر کو دیکھا کہ بڑی تیزی سے اس نے ایک شکار کو آدبوچا۔شیر کا پیٹ جب بھر گیا تو اس نے باقی ماندہ حصے کو لومڑی کے سامنے لاکر رکھ دیا۔اب اسے یہ یقین ہوگیا کہ واقعی اللہ رازق ہے۔ پھر اس کے دل میں خیال آیا جب اللہ ایک اپاہج لومڑی کو غیب سے اس طرح رزق فراہم کرسکتا ہے تو پھر ہم کو کیوں نہیں؟ پھر کیا تھا وہ اس مقام پر مصلے بچھا کر بیٹھ گیا اور خود کو ذکر وفکر میں مشغول کرلیا۔ایک دن گذرا، دوسرا دن گذرا، تیسرا دن گذرا جب کہیں سے کوئی رزق نہیں آیا تو بھوک سے اس کی حالت خراب ہونے لگی۔اس کی قوت برداشت جواب ہی دینے والی تھی کہ غیب سے آواز آئی:''اے شخص اپنے مقام سے اٹھ اور اللہ کی سنت کو اچھی طرح سمجھ لے۔انسان کو کچھ نہیں ملتا سوائے اس کے جس کی وہ کوشش کرے۔تو اس اپاہج لومڑی کی طرح نہ بن جو کسی کے جھوٹے کی محتاج ہے بلکہ اس شیر کی طرح بن جو خود اپنا رزق حاصل کرتا ہے اور اپاہجوں کا بھی خیال رکھتا ہے۔''

یہ واقعہ ہے تو بہت چھوٹا جو بچوں کو ایک کہانی کے انداز میں اپنا رزق خود حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے،لیکن اس میں بڑوں کے لئے بھی بڑی نصیحتیں ہیں۔

لوگ اپاہجوں کی طرح ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اللہ رازق ہے اس لئے رزق مل کر رہے گا۔ بلاشبہہ اللہ رازق ہے اور رزق مل کر رہے گا لیکن اس کے لئے جدو جہد

ضروری ہے۔

جولوگ محنت نہیں کرتے انہیں عزت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ان کی ذلت اورغربت دور نہیں ہوتی۔ جواپنی اوردوسروں کی ضرورت پوری کرتے ہیں وہی سماج کے سچے خادم ہیں۔

ذکروتسبیح کی طرح حصول معاش بھی عبادت ہے جس کو پورا کئے بغیر نہ تو نفس کے حقوق ادا ہوتے ہیں اور نہ بندوں کے حقوق ادا کئے جاسکتے ہیں۔ ہرصحت مند،صالح اور جوان شخص پر اپنی ضرورتوں کے ساتھ کمزوروں کی ضرورتوں کو پورا کرنا ایک اخلاقی فرض ہے اس کے بغیر سماج میں امن وتوازن برقرار نہیں رہ سکتا۔

یہ محض خیالی باتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو سنجیدگی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ انسان ایک مادی وجود ہے جس کی کچھ مادی ضرورتیں ہیں جو مادی چیزوں کے ذریعہ ہی پوری ہوتی ہیں۔انسان کو طبعی طور پر جسم وجان کے رشتہ کو برقرار رکھنے کے لئے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ توانائی اسے کھانے پینے سے حاصل ہوتی ہے۔بھوک روٹی سے مٹتی ہے۔ پیاس پانی سے دور ہوتی ہے۔موسم کے اثرات سے محفوظ رہنے اور زیبائش کے لئے کپڑے چاہئیں۔رہائش کے لئے مکان کی ضرورت ہے۔ بیمار ہوتو دوا اور دیگر ضرورتوں کی تکمیل کے لئے دیگر اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمام چیزیں مفت حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ کرۂ ارض اور اس کا جوزندگی کو باقی رکھنے کا نظام (Life supporting System) ہے وہ تو مفت ہے اس لئے کہ انسان اس کو پیسے سے نہ خود خرید سکتا ہے اور نہ اتنے بڑے پیمانے پر اس کو پیدا کرسکتا ہے۔ لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کی جتنی سبیلیں ہیں اس کے لئے اسے محنت، ذہانت اور مال صرف کرنا پڑتا ہے۔اس کے بغیر اس کا حصول ممکن نہیں ہے۔ مثلاً کھیت ہے تو جب تک اس میں کھیتی نہیں کی جائے گی ہم اناج حاصل نہیں کرسکتے۔ پانی زمین کی تہوں میں موجود ہے لیکن اسے کھود کر نکالنا پڑتا ہے۔یہی حال دوا،مکان،لباس اور دیگر ضرورتوں کا ہے۔

جب انسان ایک مادی وجود ہے تو معاش کے مسائل سے لاتعلق کیسے رہ سکتا ہے؟ کیونکہ اس

پر اس کے جسم وجان کی قوت، اس کی قوت کارکردگی ترقی واستحکام سب منحصر کرتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کب انسانوں نے ترک مادیت کی روش اختیار کی۔لیکن کوئی انسان خواہ وہ کتنا ہی بڑا جوگی ہو وہ ان ضرورتوں سے بالکلیہ انکار نہیں کرسکتا، وہ اسے کم تو کرسکتا ہے بالکل ختم نہیں کرسکتا۔جس دن وہ اس کو بالکل ختم کردیگا، اس دن خود اس کا اپنا وجود ختم ہوجائے گا۔ایسے لوگ اپنے ذاتی کمالات کے اعتبار سے چاہے جتنے محترم سمجھے جائیں سماج کی گاڑی ان کے دم قدم سے نہیں چل سکتی۔اس لئے کہ وہ انسانی خصوصیات سے ماوراء ملکوتی ہونا چاہتے ہیں جو ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی تفریط ہے جو نفس انسان اور انسانی تمدن کے لئے نقصان دہ ہے۔

انسان ایک مادی وجود ہے جس کی مادی ضرورتیں ہیں اس لئے اس کو اپنے دائرے میں رہ کر اپنے وجود و بقاء کے لئے مادی اور معاشی سرگرمی میں حصہ لینا چاہئے۔ یہی انسانی فطرت اور ضروریات کا تقاضہ ہے۔اگر آپ انسان کی بناوٹ اور اس کی ضروریات پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسان اور معاش کا رشتہ گاڑی اور ایندھن کے رشتہ کی طرح ہے۔ایندھن گاڑی کا مقصد نہیں ہے لیکن گاڑی کی ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ٹھیک اسی طرح معاش انسانی زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ تاہم یہ انسان کی ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر انسانی تمدن کی گاڑی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس لئے معاش کو انسان کی ایک فطری ضرورت قرار دیا گیا ہے۔لہٰذا اس کا حصول مطالبہ فطرت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔

عبادت کا اسلامی مفہوم اور معاش کی اہمیت

اسلام دین فطرت ہے دوسرے لفظوں میں دین انسانیت ہے۔ لہٰذا وہ انسان کی فطری ضرورتوں کی نفی نہیں کرتا۔اسلام ایک معتدل اور عقلی نظام ہے۔لہٰذا وہ عقل واعتدال کے ساتھ حصول معاش کی ضرورت واہمیت کی تلقین کرتا ہے اور اسے ایک اہم عبادت قرار دیتا ہے۔ بلکہ حصول معاش کو ایک ایسی عبادت قرار دیتا ہے جس کے بغیر نہ تو خدا کے حقوق ادا کئے جاسکتے ہیں اور نہ بندوں کے حقوق ادا ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا اسلام نے حصول معاش کے باب میں جو تعلیم دی

ہے اس کا مختصر مگر جامع تعارف ضروری ہے۔

اسلام کی رو سے اللہ نے انسانوں اور جنوں کو محض اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ عبادت کیا ہے؟ عبادت محض چند لمحوں میں چند طریقوں سے مراسم عبودیت ادا کر لینے کا نام نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو چند لمحوں اور چند طریقوں کے علاوہ انسان کے جملہ معاملات غیر عبادت قرار پائیں گے پھر اس مقصد کی نفی ہو جاتی ہے جس کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ اسلام کی نظر میں عبادت دراصل عبدیت سے عبارت ہے یعنی زندگی کا ہر وہ کام جو خدا کے حکم اور اس کی رضا کا لحاظ کرتے ہوئے کیا جائے عبادت قرار پائے گا۔ اس لئے اس کی نظر میں پوری زندگی عبادت ہے۔ عبادت کے لئے زندہ رہنا ضروری ہے، مُردوں پر کوئی عبادت فرض نہیں ہے۔ زندہ رہنے کے لئے لوازمِ زندگی ضروری ہیں۔ لوازم زندگی کے حصول کے لئے معاشی جہد و عمل ضروری ہے۔ لہٰذا معاشی جہد و عمل ایک ایسی عبادت ہے جس کے بغیر کوئی عبادت ممکن نہیں۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ عبادت کے دس حصے ہیں جس میں نو حصوں کا تعلق رزق حلال کے حصول سے ہے۔ اگر رزق حلال نہ ہو تو انسان کی ساری عبادت اکارت چلی جاتی ہے۔ لہٰذا حدیث میں آتا ہے کہ فرض عبادات کے بعد دوسرا سب سے بڑا فرض رزق حلال کا حصول ہے۔ چنانچہ قرآن میں نماز جمعہ کے باب میں یہ واضح حکم موجود ہے کہ جب نماز ادا کر چکو تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

اسلام انسان کو تجرد اور ترک دنیا اختیار کرنے سے منع کرتا ہے۔ اس کے نزدیک جنت کی راہ بھرپور خاندانی اور سماجی زندگی سے ہو کر گذرتی ہے۔ وہ مجرد آدمی کے ایمان و عمل دونوں کو غیر معتبر مانتا ہے۔ اسلام انتہا پسندی کا نہیں بلکہ اعتدال کا دین ہے۔ وہ تجرد اور ترک دنیا کا ویسا ہی مخالف ہے جیسا وہ ہر اقدار سے عاری دنیا پرستی کا۔ حضورؐ نے صاف فرمایا ہے کہ نکاح میری سنتؐ ہے جو اس سے گریز کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

انسان پر اس کے اپنے نفس کا، بیوی بچوں کا، والدین اور دیگر رشتہ داروں کا، پڑوسی اور سماج کے دوسرے افراد کا یہاں تک کہ راہ کے ساتھی اور مسافروں کا سب کا حق ہے۔ یہ حق ان کی خیر

خواہی اور ان کی مادی ضرورتوں کی فراہمی دونوں سے ادا ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلام پوری خاندانی اور سماجی زندگی گذارنے کی تلقین کرتا ہے اور حفظ مراتب کے ساتھ تمام کے حقوق ادا کرنے کا مدعی ہے۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے بتایا باپ جنت کا دروازہ ہے اور ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ جس نے یہ کہا کہ سب سے اچھا صدقہ اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرنا ہے۔ کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنا رات بھر نماز (نفل) پڑھنے اور دن بھر روزہ رکھنے سے بہتر ہے۔

عبادت جسم و مال دونوں سے عبارت ہے

حدیث میں آتا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ پہلا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ یہ کلمہ اس دین کی بنیاد ہے جس میں اللہ کی وحدانیت اور رسول ﷺ کی رسالت کو ماننے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے بعد جن چار بنیادوں پر اسلام کھڑا ہے انہیں دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جس کا تعلق وقت اور جسمانی عبادت سے ہے۔ مثلاً پانچ وقت کی نماز فرض کی گئی ہے اور رمضان کے روزے جو پورے ایک مہینہ کے ہوتے ہیں فرض قرار دیئے گئے ہیں۔ نماز میں چونکہ وقت بہت کم لگتا ہے اور اس میں بڑی جسمانی مشقت بھی نہیں اٹھانی پڑتی ہے۔ لہٰذا یہ عبادت عام ہے جو ہر مرد و عورت، امیر غریب، چھوٹے بڑے، مقیم مسافر، صحت مند و بیمار پر حالتِ امن اور جنگ ہر صورت میں فرض ہے۔ اس فرض کو اتنا ہی عموم حاصل ہے کہ کوئی شخص مومن و مسلم ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ نماز کا پابند نہ ہو۔ جان بوجھ کر ایک وقت کی نماز کا ترک کرنا آدمی کو کفر سے قریب کر دیتا ہے۔ اس لئے حدیث میں آتا ہے کہ مومن اور کافر کے درمیان فرق صرف نماز ہے۔ روزہ میں نماز کے مقابلے زیادہ جسمانی مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ خاص اوقات میں کھانا پینا حرام ہوتا ہے۔ موسم کی سختی اور نرمی سے انسان کے جسم و جان کی قوت و صلاحیت متاثر ہوتی ہے۔ گو کہ اس میں بھی عموم ہے لیکن اس عبادت میں مستثنیات زیادہ ہیں مثلاً بیمار، ضعیف، مسافر، کو چھوٹ دی گئی ہے۔ اسی طرح حاملہ اور حائضہ عورتوں کو بھی رخصت دی گئی ہے۔ بہر حال نماز اور روزہ کے بارے میں آتا ہے کہ یہ غریبوں کا اسلام ہے۔ حضورؐ نے فرمایا غریبوں کا اسلام

تین ہے ایک کلمہ لا الہ کا اقرار دوم نماز کا قیام سوم رمضان کا روزہ رکھنا۔ اگر کوئی اتنا بھی نہ کرے تو وہ ایسا کافر ہے جس کا قتل کر دینا جائز ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ مسلمان نہیں رہتا۔ یا تو وہ منافق ہے یا ایمان لانے کے بعد مرتد ہو گیا۔ کوئی شخص محض کافر ہونے کی صورت میں اس وقت تک قتل نہیں کیا جائے گا جب تک خود اس نے کسی کی ناحق جان نہ لی ہو یا مسلمانوں سے برسرِ پیکار نہ ہو۔ لیکن اگر ایک شخص مسلمان ہونے کے بعد کافر یا منافق ہو جائے تو اس کا خون از روئے شرع حلال ہو جاتا ہے۔ جان بوجھ کر نماز اور روزہ ترک کرنے والا شخص کافر اور منافق ہو جاتا ہے۔ اس لئے اُس پر اِس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اب یہ فیصلہ عام آدمی نہیں بلکہ ایک قانونی اور جائز طور پر قائم اسلامی حکومت کرے گی کہ تارک صلوٰۃ و صوم کی واقعی حیثیت کیا ہے اور اُس پر اس حکم کا کس طرح اطلاق ہوگا؟ بہر حال آج کی تاریخ میں کوئی حکومت ایسے مجرموں کو قتل کی سزا دے یا نہ دے، اس کے ایمان کا قتل ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ اگر خود کو مومن سمجھتا ہے یا کہتا ہے تو یہ خود کو بھی دھوکہ دے رہا ہے اور اپنے سماج کو بھی دھوکہ دے رہا ہے۔

ومایخدعون الا انفسھم ومایشعرون۔

اسلام کے دو اور ستون ہیں جن پر اسلام کی عمارت ٹکی ہے وہ ہیں زکوٰۃ اور حج۔ یہ دونوں مالی عبادتیں ہیں۔ جن لوگوں کے پاس اتنے مال نہیں ہیں کہ وہ زکوٰۃ دے سکیں یا حج ادا کر سکیں ان پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا۔ جس سے ان کے ایمان میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا لیکن وہ ایک اہم فرض کی ادائیگی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان عبادات کو فرض کرنے کا مقصد تو یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کو ادا کریں۔ ورنہ اس کو فرض کے بجائے نفل قرار دیا جاتا۔ یہ زکوٰۃ و حج ہر مال پر اور ہر مال والے پر فرض نہیں ہے بلکہ جس کے پاس نصاب سے زائد مال ہو اور اس پر سال گذر چکا ہو اس پر فرض ہے۔ جس پر زکوٰۃ فرض نہیں اس پر حج بھی فرض نہیں ہے۔

یہی حال قربانی، فطرہ، عشر اور دیگر انفاق کا ہے۔ تو کیا یہ سب بغیر حصول مال کے ممکن ہے؟ جب حصول مال کے بغیر عبادت مکمل نہیں ہوتی تو ایمان کیسے مکمل ہوگا؟ جس طرح بے آنکھ والے اور آنکھ والے برابر نہیں ہو سکتے اسی طرح بے مال والا اور مالدار بشرطیکہ وہ مومن ہو برابر نہیں

ہو سکتے۔ ایک بار حضورؐ سے کچھ غریب صحابیوں نے سوال کیا کہ ہمارے مالدار احباب اپنے انفاق کی بدولت ہم سے زیادہ اجر حاصل کر لیتے ہیں۔ ہم غریب لوگ اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ حضورؐ نے ان کی دلجوئی کے لئے چند کلمات کے وِرد کی تلقین کی اور بتایا اس کا اجر و ثواب انفاق مال کے ثواب سے کم نہیں ہے۔ غریب اصحاب خوش ہو گئے۔ یہ بات مالدار صحابیوں کو بھی معلوم ہو گئی۔ انہوں نے بھی ان اوراد کا ورد شروع کر دیا۔ غریب اصحاب پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورتحال کہہ سنائی۔ حضورؐ مسکرائے اور فرمایا یہ تو اللہ کا فضل ہے، وہ جس کو جتنا دے۔ معلوم ہوا کہ مالدار ایمان والے کا مرتبہ بلند ہے۔ اس لئے کہ وہ شریعت کے زیادہ تقاضوں پر عمل کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے ایماندار تاجروں کا شمار انبیاء، شہدا اور صالحین کی صف میں کیا گیا ہے۔ لہٰذا حصول معاش نہ صرف اپنی جسم و جان کی قوتوں کو باقی رکھنے اور اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے ضروری ہے بلکہ تخلیق ذات کے مقصد یعنی عبادات کے التزامات کے لئے بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد کسی شخص کو یہ کہنے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ حصول معاش محض دنیا داری ہے، بلکہ یہ ایسی دین داری ہے جس کے بغیر بسا اوقات آدمی کی دین داری مشکوک ہو جاتی ہے۔ مالی مشکلات میں مبتلا شخص پر نہ صرف یہ کہ بہت سے احکام دینی ساقط ہو جاتے ہیں بلکہ وہ مدد کا مستحق قرار پاتا ہے۔ قرض و افلاس میں گھرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اخلاقی حالت اور سماجی ساکھ بھی متأثر ہوتی ہے۔ اچھا بھلا شخص سماج میں بے وقعت ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات مالی مشکلات اسے راہِ عزیمت سے پھیر دیتے ہیں اور وہ غلط کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے حلال و حرام کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اور وہ شریعت کے حدود کو پامال کر دیتا ہے۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ غربت آدمی کو کفر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ حضورؐ نے جو دعائیں مانگیں ہیں اور امت کو جو دعائیں سکھائی ہیں اُن میں تنگ دستی، غربت، بھوک وغیرہ سے واضح الفاظ میں اللہ سے پناہ مانگی گئی ہے اور دوسری طرف فرمایا کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے میں مال بڑا ہی اچھا مددگار ہے۔ مزید فرمایا صالح آدمی کے لئے صالح مال کتنی عمدہ چیز ہے۔ اس کی وضاحت یوں فرمائی جس نے اس کو خرچ کیا اور حق کے مطابق خرچ کیا تو اس کے لئے بہت اچھا مددگار ہے۔ اس کے

بعد بھی مسلمان اگر حصول مال میں کوتاہی برتتے ہیں تو اس کو محض اُن کی کوتاہیٔ فہم اور کوتاہی عمل ہی قرار دیا جائے گا ورنہ اسلام کا اشارہ اور تقاضہ واضح ہے۔ انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے اور معاش زندگی کا اہم شعبہ ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ابن آدم اپنے رب کے سامنے سے اس وقت تک ہٹ نہیں سکتا جب تک وہ پانچ باتوں کا جواب نہ دیدے جس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ اِسی طرح پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت جاننے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جس میں افلاس سے پہلے تونگری کو غنیمت قرار دیا گیا ہے۔ یہ ساری چیزیں معاش کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہیں۔

دنیا کا اسلامی تصور

دنیا حقیر و ذلیل ہے کم مایہ اور بے وقعت ہے۔ اللہ کے نزدیک دنیا مُردار سے بدتر یا ایک قطرۂ آب سے بھی کم تر ہے۔ دنیا فنا ہو جانے والی ہے جبکہ آخرت باقی رہنے والی چیز ہے۔ یہ وہ بدیہی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ قرآن میں جگہ جگہ دنیا کو دھوکہ کی ٹٹی یا محض کھیل تماشہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ دنیاوی زندگی کا وہ پہلو ہے جو دنیا دار لوگوں کی سرزنش کے لئے اللہ نے اور اللہ کے رسولؐ نے واضح فرمایا ہے۔ لیکن دوسری طرف قرآن و حدیث میں دنیا اور حیات دنیا کی اہمیت پوری طرح اجاگر کر دی گئی ہے۔ لہٰذا دنیا اور حیات دنیا پر کوئی رائے قائم کرنے یا کوئی طرزِ عمل متعین کرنے سے پہلے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھنا چاہئے تبھی ہم راہ اعتدال پر قائم رہ سکتے ہیں۔ اسلام کی راہ ترک دنیا، تجرد اور ہوس پرستی دنیا پرستی کے درمیان سے ہو کر گذرتی ہے۔ اسلام بھرپور دنیوی زندگی جینے کا قائل ہے۔ وہ انسان کو فراری نہیں بناتا بلکہ اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دینے کی ہدایت کرتا ہے۔ وہ انسان کو اللہ کا ایک فرماں بردار بندہ بنانا چاہتا ہے جس کا مقصدِ حیات اللہ کے احکام کی بجا آوری اور اس کی مرضیات کی تکمیل ہے۔ اسے ہی عبادت کہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں وہ انسان کو زمین پر اللہ کا خلیفہ قرار دیتا ہے اور اسے الٰہی اخلاق سے متصف ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ انسان کی تمدنی اور سماجی زندگی کی ابتداء اس کے خاندان سے ہوتی ہے

اور خاندان نسل و نسب سے چلتا ہے۔ نسل و نسب کی پاکیزگی اور قیام کے لئے نکاح لازمی ہے۔ اس کے بغیر نہ تو نسب و نسل چل سکتا ہے اور نہ انسانی سماج کی پاکیزگی برقرار رہ سکتی ہے۔ اس لئے جہاں وہ ایک طرف جانوروں کی طرح آزادانہ شہوت رانی پر روک لگاتا ہے وہیں دوسری طرف تجرد کو ناپسندیدہ عمل قرار دیتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ فداہ ابی و امی نے صاف صاف اعلان کر دیا نکاح میری سنت ہے، جو اس سے اعراض برتے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ازدواجی زندگی تمدنی اور خاندانی زندگی کے دروازے کھول دیتی ہے یہیں سے حقوق و فرائض کا باب شروع ہوتا ہے۔ شوہر بیوی، ماں باپ، بھائی بہن اور دیگر رشتوں کا جنم ہوتا ہے۔ تہذیب کی بنا پڑتی ہے، معاشرے کا جنم ہوتا ہے، سیاست و معیشت کے باب کھلتے ہیں۔ ملکی اور بین الاقوامی رشتے استوار ہوتے ہیں۔ فرد اور سماج کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اب دیکھئے خالص نکاح دنیاوی عمل ہے لیکن کیسی دینی معنویت رکھتا ہے۔ جو شخص نکاح نہیں کرتا اس کا ایمان مشکوک ہوتا ہے اور کسی عذر شرعی کے بغیر اگر اس سے اعراض برتے تو اسے فلیس منی کی دھمکی دی گئی ہے کیونکہ اس صورت میں وہ دنیا اور اعمال دنیا کو برتنے کا اہل نہیں ہوتا۔ گویا اس کے اس رضا کارانہ عمل سے شریعت کا نوے فیصد حصہ معطل ہو جاتا ہے اور یہ صورتحال شارع کو ہرگز گوارہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتضائے شریعت آدمی کو دنیا کے جھنجھٹ میں مبتلا دیکھنا چاہتا ہے اور انہی امور میں انسان کی آزمائش ہے۔ قرآن نے موت و حیات کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے متعدد مقامات پر اس بات کو واضح کیا ہے تا کہ اللہ دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔ اب بہتر عمل صرف نماز، روزہ، ذکر و تلاوت نہیں ہے بلکہ بہتر عمل انسان کی جملہ مفوضہ ذمہ داریوں کی بحسن و خوبی ادائیگی کا دوسرا نام ہے۔ اس اعتبار سے حیات دنیا کی کتنی اہمیت ہے اس کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ تو ایک پہلو ہوا۔ دوسرا پہلو اس سے زیادہ واضح اور منصوص ہے۔ حضورؐ نے دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیا ہے۔ گویا دنیا جائے عمل ہے اور آخرت جائے جزاء۔ انسان کی فلاح و خسران کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ دنیا میں اس کا ایمان کیا ہے اور اعمال کیسے ہیں؟ اگر وہ صحیح العقیدہ ہے اور عمل صالح رکھتا ہے تو آخرت میں اس کے لئے کسی رنج و خوف کا موقع نہیں ہے لیکن اگر اس

کے عقائد فاسد اور اعمال پراگندہ ہیں تو وہاں مجرموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ نہ تو ان سے فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان کے حق میں کوئی سفارش کام آئے گی۔ انسان کی زندگی محدود ہے اسے ایک محدود سرمایہ سے لامحدود تجارت کرنی ہے جس کا نفع بھی بے پایاں ہے اور جس کا نقصان بھی بے حد وحساب ہے۔ اس لئے اسے بہت سنجیدہ اور ذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار کرنا ہوگا۔ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہے یہ لمحوں سے صدیوں اور قرنوں کی تجارت کا سوال ہے۔ لہٰذا اس زندگی کو محض لہو لعب میں گذارنا یا غیر سنجیدہ طرزِ عمل اختیار کرنا ایسی حماقت ہے جس کی توقع کسی ذمہ دار فرد سے جو اپنی زندگی کی حقیقتوں سے واقف ہے نہیں کی جاسکتی۔ اسلام کا اصول عدل یہ ہے کہ جس چیز کی جو حیثیت ہے اور اس کا جو مقام ہے اس کو اپنی جگہ پر رکھتے ہوئے اس سے وہی کام لیا جائے ورنہ یہ ظلم ہوگا۔ دنیا خدا کی نظر میں ادنیٰ، محدود اور حقیر ہی لیکن ہماری نظر میں یہ عظیم ہے۔ نہ معلوم کب سے یہ دنیا قائم ہے اور کب تک رہے گی؟ اس درمیان اس کرۂ ارض پر نہ جانے کتنے اربوں کھربوں لوگ آئے اور چلئے گئے۔ ہمارے لئے ہماری دنیا ہماری حیات بھر ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا بس اتنی ہی ہے جتنی ہماری حیات ہے۔ لیکن ہم اپنی حیات میں جو کام کریں گے نہ صرف یہ کہ اس کے اثرات آخرت پر منتج ہوں گے بلکہ ہمارے بعد ہمارے بچوں، ہمارے خاندان، ہمارے ماحول و معاشرے پر بھی اس کے اثرات لازماً پڑتے ہیں اور یہ سلسلہ مضروب (Multiply) ہوتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اسی کو تمدنی ارتقاء کہتے ہیں۔ تہذیبیں اسی طرح فروغ پاتی ہیں۔ اس لئے دنیا کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل دنیا کو حقیر جاننے والی حدیثوں کو صحیح تناظر میں دیکھا جانا چاہئے۔

اس میں پہلی حقیقت یہ ہے کہ دنیا خدا کی نگاہ میں حقیر ہے۔ جیسے مچھر اور مکھی ہماری نگاہ میں ہے۔ دوسرے آخرت کے مقابلے دنیا حقیر ہے جیسے کسی دائمی چیز کے مقابلے کوئی وقتی اور معمولی چیز ہو۔ وہ لوگ جو حیات دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور جن کے سامنے آخرت نہیں ہے یا جو لوگ دنیا کے دولت و اقتدار میں اتنے سرمست ہوجاتے ہیں کہ خدا کے حضور پیشی اور جوابدہی کو بھول جاتے ہیں یا اس کا انکار کردیتے ہیں ان کو یہ بتایا جارہا ہے کہ دنیا محض دھوکہ کی ٹٹی ہے۔ یہ بہت معمولی اور

حقیر ہے۔ یہاں کی دولت و اقتدار محض تمہاری چند سالہ زندگی تک محدود ہے۔ اس کے بعد تم خاک میں مل جاؤ گے۔ جہاں تمہارا موجودہ جاہ وجلال، اقتدار وقوت، دولت وسرمایہ، علم وذہانت کچھ کام نہیں آئے گا۔ اگر تمہارے عقائد صحیح نہیں ہوئے اور تمہارے اعمال اچھے نہیں ہیں تو پھر تم اُس حیات ابدی میں بڑے گھاٹے اور خسران میں ہوگے۔ تمہاری دنیاوی حیثیت تمہیں خدا کے عذاب سے نہیں بچاسکتی۔ اس لئے دنیا کو سمجھ کر برتنے اور ذمہ داری کے ساتھ جینے کی ضرورت ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ دنیا اور معاملات دنیا کو اس طرح گڈمڈ کردیتے ہیں کہ انہیں لگتا ہے حصول معاش کی جدوجہد ایک حقیر اور ادنیٰ کام ہے جس کی چنداں ضرورت نہیں۔ جبکہ بات ایسی نہیں ہے۔ یہ تمدن کی گاڑی کو کھینچنے والا وہ لازمی عنصر ہے جس کے بغیر کاروبار حیات ٹھپ پڑجائے گا۔ جس کے نتیجے میں حقوق وفرائض کا سارا دفتر بند ہوجائے گا۔ جہانِ تازہ کی آبیاری رُک جائے گی۔ گویا انسانیت اپنی موت آپ مرجائے گی۔ یہ خودکشی ہے جو اسلام میں حرام ہے۔

دنیا کے بارے میں اسلام کا یہ طرز فکر محض سلبی منطق کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ ایجابی انداز سے واضح حکم دیتا ہے۔ مثلاً قرآن اس بات کی ہدایت کرتا ہے کہ تم دنیا میں اپنا حصہ نہ بھولو۔ دنیا میں حاصل شدہ انعامات کو اللہ کا فضل قرار دیا گیا ہے۔ قرآن دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کا خواہاں ہے۔ چنانچہ مومن کو دونوں کی بھلائی طلب کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ اسلام کی نگاہ میں بخل، تبذیر، اسراف و تفاخر ناپسندیدہ ہیں۔ لیکن وہ انفاق اور زیبائش کی تلقین کرتا ہے۔ اللہ کی راہ میں اپنا دل پسند مال خرچ کرنے کو بڑی نیکی قرار دیتا ہے۔ اگر اللہ نے کسی کو کچھ دیا ہے تو اس کا اظہار اس کے لباس پوشاک، کھانے پینے اور طرز رہائش سے ہونا چاہئے۔ یہ تحدیث نعمت ہے۔ انسان کی حیثیت اس کی طرز رہائش سے جھلکنی چاہئے۔ یہ دنیا کو برتنے کا ایک ایسا سلیقہ سکھاتا ہے جس میں انسان تفاخر اور نمو کے بغیر طبیعت کی پوری سادگی اور شرافت کے ساتھ خدا کی نعمتوں اور انعامات سے متمتع ہوسکتا ہے۔ خدا کو ریا اور نمود ناپسند ہے۔ لیکن اس کی نعمتوں کا اظہار ہو نہ صرف یہ کہ پسندیدہ ہے بلکہ اس کی تلقین کی گئی ہے۔

حصول مال اور حقوق العباد

اسلام کی نظر میں وہ شخص پسندیدہ ہے جو اپنی محنت اور اس کی حاصل شدہ آمدنی سے اپنی اور اپنے بیوی بچوں، ماں باپ اور دیگر اہل خانہ کی ضرورتوں کی کفالت کرتا ہے۔ اسلام نہ صرف یہ کہ ان کی موجودہ اور روزمرہ کی ضرورتوں کی کفالت کی ترغیب دیتا ہے۔ بلکہ ان لوگوں کو اچھے والدین میں شمار کرتا ہے جو اپنے مرنے کے بعد اپنے بچوں کے لئے افلاس و تنگ دستی سے حفاظت کا سامان کر جاتے ہیں۔ یعنی وہ صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ اپنے بچوں اور دیگر لوگوں کیلئے بھی بچت کی تلقین کرتا ہے تاکہ یہ محفوظ سرمایہ بوقت ضرورت کام آسکے۔ جو لوگ اپنے مرنے کے بعد مال و اسباب چھوڑ جاتے ہیں انہیں بھی اور ان کے بچوں کو بھی مرنے کے وقت اطمینان رہتا ہے۔ اسلام میں وراثت و وصیت کا پورا قانون اسی نکتہ کے اردگرد گھومتا ہے۔ اسلام میں فرق مراتب کے ساتھ کفالت کا اصول بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے۔ یہ تمام تر باتیں بھرپور معاشی جدوجہد کی طرف اشارہ کرتی ہیں جن کا صحیح ادراک ہونا ضروری ہے تاکہ اس کی حقیقت کو ہم اچھی طرح سمجھ سکیں۔

پیسہ کے بغیر دینی ضرورتوں کی تکمیل بھی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو قرض حسن دینے کی تلقین کی ہے۔ اب اگر بندے کے پاس کچھ ہوگا ہی نہیں تو بندہ قرض کیا دے گا اور کہاں سے دے گا؟ اللہ نے مومن بندوں سے یہ کہا کہ ایمان ایک معاہدۂ بیع ہے۔ جس میں ان کی جان و مال دونوں شامل ہیں۔ تبلیغ دین کے لئے پیسے کی ضرورت ہے، اشاعت دین کے لئے پیسہ کی ضرورت ہے، دین کی حفاظت کے لئے پیسے کی ضرورت ہے۔ جہاد و قربانی کے بغیر دین کا کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ جہاد و قربانی صرف نفس اور جان سے ممکن نہیں ہے اس کے لئے مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جتنی بڑی قوت سے مقابلہ ہوگا اتنے ہی مال و جان کی ضرورت ہوگی۔ جنگ تبوک کے موقع پر جب اس وقت کی رومی سلطنت سے مقابلہ ہوا تو حضورؐ نے اسی طرح کی تیاری بھی کی جس کے واقعات سے سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ آج ہمیں جن قوتوں سے مقابلہ

ہے ان کے پاس بڑا سرمایہ ہے، زبردست ٹکنولوجی کی قوت ہے اور بے پناہ انسانی وسائل بھی موجود ہیں۔ لہٰذا ان سے مقابلہ آرائی کے لئے ہمیں بھی بھرپور تیاری کرنی ہوگی اور ہر ہر محاذ پر ان سے نبرد آزما ہونا ہوگا۔ یہ کام بغیر پیسہ کے ممکن نہیں۔ اس لئے ہمارے حصول معاش کا ایک مقصد یہ بھی ہے اور ہونا چاہئے کہ ہم زیادہ سے زیادہ پیسہ کمائیں تاکہ دین کو اس وقت جن چیلنجیز کا سامنا ہے اس کے لئے وسائل اکٹھا کئے جاسکیں۔ اس لئے پیسہ کمانا ایک بڑی دینی ضرورت بھی ہے۔ جب ہم کمائیں گے ہی نہیں یا کم کمائیں گے تو ہم خود کیا کھائیں گے اور دوسروں کو کیا کھلائیں گے۔ ہمارے پاس خالی خولی تلقین کے علاوہ باقی کیا رہ جائے گا؟ اور اس سے کیا کام بنے گا۔ لہٰذا ایک صالح نیت کے ساتھ مالی جدوجہد میں جٹنا ایک اہم دینی فریضہ ہے۔

اسلام امیر و غریب سب کا دین ہے۔ سماج کو اجتماعی فلاح کے منصوبہ کی تکمیل کے لئے مالیات کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا حقوق العباد کا پورا کا پورا دفتر مالی حقوق کی ادائیگی یا مادی ضرورتوں کی تکمیل سے بھرا ہے۔ بھوکے کو کھانا چاہئے۔ بیمار کو دوا کی ضرورت ہے۔ سر پر سایہ چاہئے۔ یتیموں اور بیواؤں کی خبرگیری کے لئے غریبوں اور بے روزگاروں کی مدد کے لئے گویا ہر کام کے لئے پیسہ کی ضرورت ہے۔ اور یہ پیسہ بغیر کمائے حاصل نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا حصول معاش کی جدوجہد کو ہم کسی طرح نظر انداز نہیں کرسکتے۔

اسلام مفت کی روٹی توڑنے، کاہلی، کاہل انگاری، بھیک اور حرام خوری کو ناپسند کرتا ہے۔ وہ محنت کی کمائی، سخت کوشی، بیوی بچوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے محنت کرنے اور دوڑ دھوپ کرنے کو صرف پسندیدہ عمل ہی نہیں بلکہ ایک عبادت قرار دیتا ہے۔ بھیک مانگنا ایک ذلیل ترین پیشہ ہے، جس سے گریز کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی طرح باپ دادا کی دولت پر عیش موج کرنے والوں کو بھی وہ پسند نہیں کرتا۔ بلکہ کما کر کھانا اور دوسروں کو بھی کھلانا اس کی نظر میں صحیح اسلامی طرز حیات ہے۔ وہ جہاں سائل کو جھڑکنے سے منع کرتا ہے اور مسکین کی کھوج لگا کر مدد کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ غریبوں، معذوروں، مسافروں، بیوہ، یتیم، غلام، مقروض، بیمار اور دیگر کمزور بے سہارا طبقات کی مدد، خدمت، نگرانی، حفاظت اور ضرورت کی تکمیل کی ہدایت [illegible]

ہے وہیں ہر چھوٹی بڑی ضرورت کیلئے بے غیرتی کے ساتھ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو ایک ذلیل اور ناپسندیدہ عمل قرار دیتا ہے۔ ایک ہٹا کٹا شخص حضورؐ کے پاس دست سوال لے کر حاضر ہوا۔ آپؐ نے اسے کچھ دینے کے بجائے پوچھا تمہارے پاس کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ پھر آپؐ نے اس سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اس کے پاس ایک زرہ ہے۔ آپؐ نے اسے اس زرہ کو بیچنے کی ہدایت کی۔ اس نے اس زرہ کو بیچ دیا۔ اس سے جو رقم حاصل ہوئی اس سے آپؐ نے اسے ایک کلہاڑی خریدنے کے لئے کہا۔ وہ جب کلہاڑی خرید کر لے آیا تو آپؐ نے اپنے دست مبارک سے اس میں دستہ لگایا اور اس سے کہا جاؤ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاؤ اور بازار میں بیچو۔ اللہ اس سے تمہیں برکت دے گا۔ اس عمل سے جلد ہی اس کی ذلت وغربت دونوں دور ہوگئی۔

حصول معاش کے سلسلے میں چند بڑے صحابہ کا طرز عمل بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ مکہ سے ہجرت کر کے جو اصحاب مدینہ تشریف لائے جہاں ایک طرف انصار نے دینی اخوت کی نادر مثال پیش کرتے ہوئے اپنے دینی بھائی کے لئے سب کچھ آدھا آدھا بانٹ کر دیدینے کی پیش کش کی وہیں بہت سے اصحاب نے اس کو قبول کرنے کے بجائے بازار کا رخ کیا اور اپنے وقت کے کامیاب اور بڑے تاجر ہوئے جنہوں نے ایمان اور انفاق کی ایسی مثالیں قائم کی ہیں جو ہر مسلمان کے لئے قابل اتباع ہیں۔ لہٰذا حصول دنیا کی جدوجہد بری نہیں ہے، اگر آدمی کی نیت درست ہے اور وہ ایمان وعمل صالح کا پابند ہے۔ تناسب بگڑنے سے اکثر تریاق زہر ہو جاتا ہے۔ اور صحیح تناسب میں لیا جائے تو زہر بھی تریاق ہو سکتا ہے۔ لہٰذا دنیا کو بھی اسی تناسب میں برتنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ آخرت کی کھیتی بنی رہے جس سے آخرت میں اچھے پھل کاٹنے کی امید باقی رہے۔ جس نے اس نقطۂ نظر کو ترک کر کے دنیا کے حصول کی کوشش کی تو اس کے لئے آخرت مین کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ جو بہر حال اسلام کے متوازن نظریۂ حیات کے منافی ہے۔ اسلام فرار اور انہماک کے درمیان دنیا کو اعتدال کے ساتھ مگر بھرپور طریقہ سے برتنے کا قائل ہے۔ یہ رسی پر چلنا نہیں ہے بلکہ ایک سیدھی صاف اور چوڑی شاہ راہ پر احتیاط اور ضبط کے ساتھ صحیح سمت میں تیز

رفتاری کے ساتھ چلنا ہے تاکہ آدمی بحفاظت اپنے مقام پر جلد پہنچ جائے جو اس کے لئے خوشی اور اطمینان کا باعث بنے۔

حصول مال کا اسلامی مقصد

اسلام کی نظر میں حصول معاش کے تین بڑے مقاصد ہیں۔

1. اپنی اور اپنے اہل خانہ کی ضرورتوں کی تکمیل۔
2. دینی ضرورتوں کی تکمیل اور
3. ابنائے نوع کی ضرورتوں کی تکمیل۔

علامہ ابن قیم نے اسلامی شریعت کے مزاج پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ ''شریعت کی بنا حکمتوں پر ہے اس میں اصل توجہ معاش اور معاد میں انسانی مصالح کی طرف ہے۔ شریعت سراسر عدل، مجسم رحمت اور سراپا حکمت و مصلحت ہے... دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح و سعادت اس سے وابستہ ہے۔''

شاطبی کے مطابق۔ ''شریعت اپنی پانچ بنیادی ضروریات کے تحفظ کے لئے وضع کی گئی ہے۔ یہ ضرورتیں دین، جان، نسل، مال اور عقل ہیں۔'' محمد بن محمد ابو حامد الغزالی کے بقول ان پانچ مقاصد کا تحفظ مصالح شریعت کے تحت آتا ہے اور جو چیزیں بھی ان بنیادی امور کو ضائع کرنے والی ہیں وہ مفسدہ ہیں اور ان کا دور کرنا مصلحت ہے۔''

امام ابن تیمیہ اپنے ایک معروف رسالہ میں معاشی جدوجہد کو فرض کفایہ قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ ''اسی طرح ہو سکتا ہے کہ عوام الناس کے لئے ضروری ہو کہ کچھ لوگ صنعتی کاموں میں مشغول رہیں۔ مثلاً عوام کاشت کاری، کپڑا بننے کی صنعت اور صنعتِ تعمیر کے محتاج ہیں کیونکہ ان کو کھانے کے لئے غلہ پہننے کے لئے کپڑا اور رہنے کے لئے مکان ملنا بہر حال ضروری ہے۔''

اس لئے متعدد فقہائے اسلام مثلاً شافعیؒ اور احمد بن حنبلؒ کے ساتھیوں اور دوسرے مفکرین

مثلاً الغزالیؒ اور ابن الجوزیؒ وغیرہ یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ ساری صنعتیں فرض کفایہ ہیں کیونکہ ان کے بغیر مصالح عام کا تحفظ ممکن نہیں ہے۔ امام نوویؒ کے بقول ''صنعت وحرفت اور وہ تمام امور جو معاشی زندگی کے لئے ضروری ہیں فرائض کفایہ میں شمار ہوتے ہیں۔''

اسی طرح مال کمانا اور اس کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اپنے مال کی حفاظت میں کوئی شخص اگر مارا جائے تو اسے شہید قرار دیا جائے گا۔ اور مال چھیننے والا اگر قتل ہو جائے تو جہنم رسید ہوگا۔

اسلام افراط وتفریط سے بچتے ہوئے معاشی تمتع کا قائل ہے۔ سورہ اعراف آیت ۳۲ میں صاف صاف حکم ہے کھاؤ پیو اور اسراف نہ کرو، بلاشبہ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح سورہ الفرقان میں اللہ کے بندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا گیا۔ ''جو خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں نہ بخل بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال کی روش اختیار کرتے ہیں۔''

(سورہ الفرقان ۶۷)

ابن عباس کے بقول اسراف اور گھمنڈ سے بچتے ہوئے جو جی چاہے کھاؤ اور جو جی چاہے پہنو۔ آدمی کا لباس اس کی حیثیت کے مطابق تو ہو مگر وہ نہ بہت قیمتی ہو اور نہ بہت گھٹیا۔ مسند احمد کی ایک حدیث ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے پر اس کی نعمت کا اثر دیکھا جائے۔ اسلام ایک مہذب اور باوقار زندگی کا قائل ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''وسیع مکان، نیک پڑوسی اور عمدہ سواری آدمی کی بہبود میں داخل ہیں۔''

توکل اور قناعت کا صحیح مفہوم

دنیا کی طرح توکل اور قناعت کے بارے میں بھی ہماری رائے میں جھول پایا جاتا ہے۔ توکل کا نام ہرگز نہیں ہے کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور اس انتظار میں رہے کہ غیب سے اسے کچھ نہ کچھ حاصل ہو جائے گا۔ حیاتِ دنیا عمل سے عبارت ہے۔ عمل کے بغیر یہاں کچھ حاصل نہیں ہوتا نہ دین نہ دنیا نہ رزق نہ علم۔ اس لئے کوشش کرنا اور کوشش کے نتیجے کو خدا پر چھوڑ دینا یہ

توکل ہے۔ توکل یہ نہیں کہ آدمی کوشش ہی نہ کرے اور خدا سے اچھی امید رکھے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھنی چاہئے کہ معاملات ونتائج کی کنجی خدا کے ہاتھ ہے۔ وہ جس عمل میں چاہتا ہے برکت دیتا ہے اور جس عمل کو چاہتا ہے مٹھ مار دیتا ہے۔ کبھی کبھی ہماری بہترین کوششیں نتائج کے اعتبار سے ناکام ہو جاتی ہیں اور کبھی کبھی ہماری تھوڑی سی بھی کوشش بڑے نتائج پیدا کر دیتی ہے۔ جو اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ سب کچھ ہمارے کرنے اور سمجھنے سے نہیں ہوگا بلکہ اس میں قدرت کی مرضیات کا بھی دخل ہے۔ یہ تو ہوئی وہ بات جو نتائج کے اعتبار سے ہے لیکن ہمیں ملے گا تبھی جب ہم کوشش کریں گے۔ مثال کے طور پر کسان کھیت جوتتا ہے۔ پانی پٹاتا ہے، کھاد اور دوا ڈالتا ہے۔ پھر زمین میں بیج ڈال دیتا ہے۔ کسان نے اپنے حصے کا عمل پورا کر لیا۔ اب بیج سے فصل اگانا، فصل پکانا اسے ارضی اور سماوی آفات سے بچانا یہاں تک کہ فصل کاٹ کر کھلیان سے گھر اور گھر سے بازار تک پہنچانے کا جو مرحلہ ہے یہ سب اس کی دسترس سے باہر ہے۔ لہٰذا اس صورت میں وہ خدا سے اچھی امید رکھتا ہے اور اس پر توکل یعنی وہ بھروسہ کر رہا ہے۔ لیکن اگر وہ کھیتی ہی نہ کرے تو پھر توکل کب اور کس بات پر۔ دنیا میں اسباب وعمل کا قانون نافذ ہے جس کو سنت الٰہی کہتے ہیں اور یہ سنت الٰہی کبھی نہیں بدلتی۔ اس لئے انسان کو اس کا نتیجہ بالعموم اس کی کوشش کے بقدر حاصل ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے بسا اوقات اسے غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ سب کچھ اس کے کرنے اور چاہنے سے ہوتا ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ کسی کام کو روبہ عمل لانے اور کامیاب بنانے میں بہت سارے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اس لئے کبھی کبھی نتیجہ اس کی توقع کے برعکس ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اسے مایوسی ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں اسلام نے دو نسخے بتائے ہیں۔ پہلا اپنے طور پر بھرپور کوشش کرنا دوسرا اللہ سے اچھا گمان رکھتے ہوئے اس کے نتیجے کو اللہ پر چھوڑ دینا۔ اگر اچھا نتیجہ برآمد ہوا تو شکر بجا لانا اور خدانخواستہ توقع کے خلاف ہوا تو اپنی ناکامیوں کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے پھر سے پوری دلجمعی کے ساتھ کوشش کرنا۔ یہی کامیابی کی کنجی ہے اور اسی کو توکل کہتے ہیں۔ توکل ایک مثبت عمل ہے یہ منفی نظریہ نہیں ہے۔ خدا بندے کے گمان کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے نوے پنچانوے فیصد معاملات میں اس کو کامیابی ملتی ہے۔ لیکن پانچ دس فیصد معاملات ایسے بھی

ہوتے ہیں جہاں اس کی توقعات پوری نہیں ہوتیں بلکہ کبھی کبھی اس کے بالکل برعکس ہوجاتا ہے۔اس صورت میں ہمت ہار جانا، ناامید اور مایوس ہوجانا، خودکشی کرلینا، آگے کا عمل ترک کردینا یا دوبارہ کوشش نہ کرنا قطعاً صحیح نہیں۔اس صورت میں توکل اس لنگر کی طرح ہے جو آدمی کو ڈوبنے سے بچالیتی ہے اور پھر عمل پر آمادہ کرتی ہے۔قرآن کہتا ہے خدا سے مایوس وہی ہوتے ہیں جو کافر یعنی اس کی قدرت کے منکر ہیں۔ورنہ جس خدا نے ایک بار ہماری کوششوں کو ناکام کردیا وہی ہماری کوششوں کو دوبارہ کامیاب کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

ناکامی اور کامیابی تو اضافی شے ہے۔کبھی ناکامی ہماری ہمت وحوصلہ کا امتحان لینے کیلئے ہوتی ہے تو کبھی وہ محض ایک آزمائش کے طور پر ہوتی ہے تو کبھی اس بات کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہوتی ہے کہ ہمارے مقابل قوت ہم سے زیادہ بہتر قوتِ کار رکھتی ہے۔اس کی تنظیم، اجتماعیت، کام کرنے کا ڈھنگ، سلیقہ وتہذیب ہم سے بہتر ہے۔خدا عموماً معاملاتِ دنیا میں کسی کا طرفدار نہیں ہوتا۔یہاں کھلی مسابقت ہے۔اچھے عمل کا اچھا بدلہ ملے گا ضرور لیکن آخرت میں۔دنیا میں اہل حق کو زخم بھی کھانے ہوں گے۔ایذاء بھی سہنی ہوگی۔بھوک اور رزق کی کمی سے آزمایا بھی جائے گا۔اور جان و مال کا زیاں بھی ہوگا۔ان سبھی مرحلوں میں شکر اور صبر کی روش پر قائم رہتے ہوئے جدوجہد کرنا ہی توکل الی اللہ ہے۔حدیث میں آیا ہے کہ چڑیا صبح میں اپنے گھونسلے سے خالی پیٹ نکلتی ہے اور شام کو شکم سیر ہوکر اپنے گھر واپس آتی ہے۔یہ توکل ہے۔اس حدیث سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔چڑیا کا گھونسلے سے نکلنا، دوسرا رزق کی تلاش کرنا اور تیسرا جو حاصل کیا اس پر قانع ہونا۔جب تک اول دو باتیں پوری نہیں ہوتیں تیسرے کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔لہٰذا توکل جہد مسلسل کے نتیجے میں حاصل شدہ وہ پھل ہے جس پر بندے کو قانع ہونا چاہئے۔

قناعت ہوس کی ضد ہے۔ہوس هل من مزيد کا ہم معنیٰ ہے۔ایک بے پیندے کا حوض۔ایک کبھی نہ مٹنے والی بھوک۔ایک قطعہ اراضی ہے تو دوسری ہوجائے۔دوسری ہے تو تیسری۔یہاں تک کہ مال جمع کرتے کرتے آدمی قبر کی منزل میں پہنچ جاتا ہے۔لیکن اس کی ہوس جاہ و مال ختم نہیں ہوتی۔جبکہ قناعت آدمی کو پیسہ کمانے والی مشین نہیں بناتی بلکہ اس کی جدوجہد کو اس کی

ضرورتوں تک محدود کرنا چاہتی ہے۔دراصل انسان کی زندگی صرف مادی وسائل سے ہی عبارت نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اخلاقی اور روحانی وجود ہے۔روح اور جسم، مادہ اور اخلاق دونوں کا توازن برقرار رہنا چاہئے تبھی فرد اور سماج کا رشتہ صحت مند خطوط پر استوار رہ سکتا ہے۔ورنہ اس میں عدم توازن بڑے فساد کا موجب ہوگا۔قناعت کی پہلی لازمی شرط یہ ہے کہ آدمی ناجائز انتفاع کے تمام راستوں کو مسدود کردے اور صرف جائز آمدنی پر اکتفاء کرے۔آمدنی کے ذرائع بھی جائز ہونے چاہئیں اور اس کا خرچ بھی جائز امور میں ہونا چاہیے۔قناعت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ضرورتوں کی اندھی دوڑ سے گریز کیا جائے اور محض حیوان صارف بن کر نہ رہا جائے۔تیسرا مفہوم یہ ہے کہ صرف اپنی ضرورتوں پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی ضرورتوں پر بھی دھیان دیا جائے۔لیکن یہ سب باتیں نتائج کے اعتبار سے ہیں۔قناعت اور بے عملی کا کہیں کوئی جوڑ نہیں ہے۔ لہٰذا کچھ نہ کرنا یا تھوڑا بہت کچھ کرلینا اور یہ سمجھنا کہ ہم قناعت کی روش پر قائم ہیں تو اس کو قناعت نہیں کہتے۔ آدمی کی مشغولیات بہت سی ہوتی ہیں۔وقت اور حالات کے ساتھ ان کی اہمیت گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے۔ایک شخص جو دن رات حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں سرگرم ہو اور خود اپنی معاش کے لئے بہت کم وقت نکال پاتا ہو، وہ قوت لایموت کے اصول پر قائم رہتا ہو اور یہ چیز جبری نہیں اختیاری ہو تو پھر اس کو قناعت کہیں گے اور یہ پسندیدہ عمل قرار پائے گا۔افراد کی قربانیوں سے ہی قوموں کا بھلا ہوتا ہے۔لہٰذا یہ قناعت وہ قربانی ہے جو ایک فرد یا گروہ موجودہ یا آنے والی نسلوں کے وسیع تر مفادات کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔مگر اس صورت میں بھی اپنے بیوی بچوں کی ضروریات سے دست کش ہوجانا صحیح نہیں ہے بلکہ اس صورت میں کئی دوسرے مفاسد پیدا ہوتے ہیں جس سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

انسانی ضروریات کا تعلق تمدنی ارتقائے سے ہے۔جیسے جیسے انسانی تمدن کا فروغ ہوتا جائے گا اس کی ضروریات کی نوعیت بدلتی جائیگی۔اس لئے قناعت کے مفہوم اور اس کے تقاضہ میں بھی تبدیلی ہوگی۔مثال کے طور پر بچوں کی تعلیم ایک لازمی ذمہ داری ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ یہ ایک مہنگا عمل ہوتا جارہا ہے۔لہٰذا ان کے تعلیمی اخراجات کی ادائیگی کے لئے پہلے سے زیادہ محنت

لڑنے، مال کمانے اور جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح لباس، پوشاک، مکان، دوا دارو، سواری اور دیگر ضروریات ہیں۔ اس طرح قناعت کوئی جامد تصور نہیں بلکہ ایک حرکی تصور ہے۔ اس کے خدوخال وقت اور زمانے کے تقاضے کے تحت تغیر پذیر ہیں۔ چونکہ زمانہ ارتقاء پذیر ہے اس لئے اس سے وابستہ تمام تصورات بھی ارتقاء پذیر ہوں گے۔ لہٰذا ان تصورات کا مفہوم متعین کرتے وقت، وقت، سماج، تمدنی حالات اور دیگر اسباب وعوامل کو سامنے رکھنا چاہئے تبھی ہم زندگی کا ایک حرکی اور ارتقاء پذیر تصور حاصل کر سکتے ہیں اور تبھی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسلام ایک دائمی تصورِ حیات ہے جو وقت اور حالات کے ساتھ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ ورنہ اسے اگر ہم جامد مان لیں گے تو زمانہ ہمیں ایک خاص مقام پر چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا۔ آج اسلام کے سامنے جو چیلنجز ہیں وہ یہی ہیں کہ ہم کیسے اس کو اس عہد کی ضرورتوں کا کفیل بنائیں تا کہ لوگ یہ جان سکیں کہ اسلام جیسے آج سے پندرہ سو سال پہلے لوگوں کا صحیح دین تھا ویسے ہی آج بھی ایک صحیح دین اور صحیح نظریۂ حیات ہے۔

ہم نے اسلام میں حصول معاش کی جدوجہد کی اہمیت کے باب میں یہ طویل بحث اس لئے کی تا کہ اس مسئلہ میں ہمارا ذہن پوری طرح صاف رہے۔ ہمارا ماننا ہے کہ ہماری معاشی پس ماندگی کے اسباب میں ایک سبب ہماری اس ذہنیت (Mindset) کا بھی ہے جو ایک زوال پذیر معاشرے میں رہنے کی وجہ سے اسلام کی ناقص فہم سے پیدا ہوا ہے۔ لہٰذا جب تک اس کی اصلاح نہیں ہوتی ہم دینی تقاضوں کے تحت معاشی بہتری کی راہ متعین نہیں کر سکتے۔

دین سے بے پرواہ ہوکر معاشی جدوجہد کی راہ متعین کرنا جتنا غلط ہے اتنا ہی غلط دینی تقاضوں کو صحیح تناظر میں نہ سمجھنے کی وجہ سے اس کو اپنی بے عملی کی دلیل بنانا ہے۔ لہٰذا پہلی اصلاح نقطۂ نظر کی اصلاح ہے۔ پھر عملی اصلاح پر دھیان دیا جائے گا۔ اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ اگر قیامت قائم ہوجائے اور تمہارے ہاتھ میں ایک پودا ہو اور تمہیں اتنا موقع ہو کہ تم زمین میں اس کو بو سکو تو ضرور بو دو۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس وقت اس پودے کو بونے کا کیا تُک ہے جبکہ سب کچھ فنا ہوجائے گا۔ لیکن اس وقت بھی اس کو ضائع کرنے کے بجائے بونے کی

ہدایت کی گئی جس سے شارع کا مقصد ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آدمی کو ہر حال میں مثبت اندازِ نظر رکھنا چاہئے۔ اپنے عمل اور اپنی ذمہ داری سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔ نتائج سے بے پرواہ ہوکر کام کرنا چاہئے۔ عمل کر کے اللہ سے اچھی امید رکھنا چاہئے۔ اگر آج یہ اندازِ نظر ہم میں پیدا ہوجائے تو پھر نہ صرف یہ کہ ہمارا بہت سارا معاشی مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ زندگی کے بہت سے دیگر مسائل بھی حل ہوجائیں گے۔ اس اندازِ نظر کو عام کرنے کی ضرورت ہے تبھی مسلمانوں کی معاشی بہتری کی راہ نکلے گی اور لوگ محنت اور منصوبہ بندی کے ساتھ عمل کرنے پر آمادہ ہوں گے۔
واقعہ مشہور ہے کہ ایک بوڑھا شخص جس کی عمر ستر اسی سال تھی اخروٹ کا ایک درخت لگا رہا تھا جو غالباً ساٹھ ستر سال میں پھل دیتا ہے۔ خلیفہ مامون نے اس کو دیکھا اور دریافت کیا کیا اس کو یقین ہے کہ وہ اس کا پھل کھا سکے گا؟ اس شخص نے جواب دیا ہمارے باپ دادا نے درخت لگایا تھا اس کا پھل ہم نے کھایا اور ہم جو درخت لگا رہے ہیں اس کا پھل ہمارے بچے اور بچوں کے بچے کھائینگے۔ اگر یہ تسلسل قائم نہ رہے تو دنیا کا نظام ہی درہم برہم ہوجائے گا۔ ہر نسل اپنے سے پہلی نسل کی وارث ہوتی ہے اور دوسری نسل کے لئے وراثت چھوڑتی ہے۔ خلیفہ مامون اس بوڑھے شخص کی بات سے بہت خوش ہوا اور اس نے اس کو ڈھیر سارا انعام عطا کیا۔ بوڑھے شخص نے کہا میں نے اپنی محنت کا اجر پالیا اب یہ پیڑ اور اس کا پھل میرے بچوں کے لئے انعام ہے۔

حیات انسانی کا یہی تسلسل ہے جو ترقی وارتقاء کی ضمانت ہے۔ اسلام دین فطرت ہونے کے ناطے کس طرح اس اصول عام کو نظر انداز کرسکتا ہے۔ اس لئے حصول مال، جدوجہد اور بھرپور معاشی عمل نہ صرف ایک شرعی ضرورت ہے بلکہ ایک عبادت ہے۔ جس کے بغیر نہ تو عبادت مکمل ہوگی اور نہ مقبول۔

□ □ □

باب دوم

ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی ترقی کی ضرورت واہمیت

مسلمانوں کے معاشی اور سماجی مسائل

ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کو جن بڑے بڑے سماجی مسائل کا سامنا ہے اس کی بنیادی وجہ ان کی معاشی تنگی اور غربت ہے۔

۱۔جہالت

مسلمانوں میں جہالت عام ہے۔ اس کی دو بڑی وجہیں ہیں ایک شعور کی کمی اور دوسرے غربت، بلکہ شعور کی کمی کی بڑی وجہ غربت ہی ہے۔ اس لئے وہ اپنے بچوں کو پڑھانے کے بجائے کام پر لگانا پسند کرتے ہیں تاکہ یہ بچے ان کی معاشی محرومی کو کم کرنے میں مددگار ہوں یا کم از کم ان پر معاشی طور پر بوجھ نہ بنیں۔ ایک عام اندازے کے مطابق ہریجنوں کے بعد مسلمانوں میں بچہ مزدوروں کی تعداد دوسرے تمام طبقات سے زیادہ ہے۔ کسی قوم کی محرومی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس کی قیمتی نسلوں کا زیاں ہورہا ہے۔

۲۔سماجی پسماندگی

مسلمانوں میں جو پس ماندہ ذات اور برادریاں کہی جاتی ہیں ان کی پس ماندگی کی بنیادی وجہ غربت ہے جس کی کوکھ سے جہالت اور بے شعوری جنم لیتی ہے اور اسی دوہری مار نے ان کو بے وقعت اور بے وزن بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس لئے ملت کی تقویت کا کوئی خواب اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک مسلمانوں کی عمومی غربت میں کمی نہیں ہوتی۔

۳۔تغزیہ کی کمی

غربت کا دوسرا مظہر تغذیہ اور طاقت کی کمی اور طرح طرح کی بیماریوں کا ہونا ہے۔ عام طور پر

جسم وجان کی قوت کو باقی رکھنے اور ضروری طاقت حاصل کرنے کے لئے غذائی قوت (Calorie) کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بالعموم سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 30% فیصد لوگ انتہائی غربت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ جس کے باعث ان کو ضروری خوراک، صحت، تعلیم اور رہائش کی بنیادی سہولتیں بھی میسر نہیں ہیں۔

ان اعداد وشمار کا دیگر اعداد شمار سے ملا کر اگر تجزیہ کیا جائے تو مسلمانوں میں محرومین کا تناسب 70% فیصد تک جاتا ہے یعنی مسلمانوں کی 70% فی صد آبادی غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گذار رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کھانے میں ضروری تغذیہ (Nutrients) کی کمی پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں Mal Nutrition کی شکایت زیادہ ہے جس کی وجہ سے ان کی عمومی صحت کمزور ہوتی ہے۔ بچے Underweight پیدا ہوتے ہیں۔ ماؤں کی صحت خراب رہتی ہے۔ ان کے یہاں اموات اطفال کی شرح زیادہ ہے اور زچگی کے وقت ماؤں کی موت کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ٹی بی کے مریضوں میں 60 فی صد مریض مسلمان ہوتے ہیں۔ اسی طرح پیٹ کے امراض کا شکار مسلمانوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ مسلمان کثرت سے بڑے گوشت کا استعمال کرتے ہیں اس لئے وہ اس طرح کے امراض کے شکار رہتے ہیں جبکہ بات ایسی نہیں ہے۔ دراصل اس کی وجہ سے ان کو ضروری پروٹین مل جاتا ہے جس کو حاصل کرنے کا دال کے علاوہ اس سے اور کوئی سستا ذریعہ نہیں ہے۔ اور اگر جانور لاغر اور بیمار نہ ہو تو اس کا گوشت صحت بخش ہوسکتا ہے۔ ان کے اندر بیماری کے پیدا ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ غربت کے باعث انہیں گندی بستیوں میں رہنا پڑتا ہے جہاں چاروں طرف گندہ پانی جمع رہتا ہے۔ کھانا تو کھانا صاف پانی بھی میسر نہیں ہوتا۔ بلاشبہہ اس میں تھوڑی ان کی ذہنیت، سہل پسندی اور غلط سماجی ماحول کا بھی دخل ہے اور سماج کے باشعور اور مذہبی طبقہ کی عدم دلچسپی بھی اس کی ذمہ دار ہے۔ لیکن غربت اس کا بنیادی سبب ہے جس کا ازالہ کئے بغیر اس مسئلہ کو حل نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ تعلیم چھوڑنے کی وجہ

مسلمان بچوں کی بڑی تعداد کسی تعلیم گاہ میں جاتی ہی نہیں اور جو تھوڑی تعداد جاتی بھی ہے ان میں ڈراپ آؤٹ ریٹ بہت زیادہ ہے۔ دسویں درجات تک پہنچتے پہنچتے ان کا ڈراپ آؤٹ ریٹ 97 فی صد تک ہو جاتا ہے۔ مشکل سے 3 فی صد مسلمان بچے انٹر میڈیٹ اور اوپر کے درجات تک پہنچ پاتے ہیں۔ مسلمانوں میں ہائیر ایجوکیشن کا تناسب صرف ایک فی صد ہے۔ اس ڈراپ آؤٹ کی بنیادی وجہ غربت ہے۔ مسلمان والدین اپنی معاشی تنگی کے باعث تعلیم کے روز افزوں بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے میں خود کو نا اہل پاتے ہیں۔ اس لئے مسابقت کے اس دور میں اپنے بچوں کو اچھی اور اعلیٰ تعلیم دلوانا ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ مجبوراً بچوں کو درمیان میں تعلیم چھوڑ کر بے روزگاروں کی فوج میں شامل ہونا پڑتا ہے یا پھر کوئی چھوٹا موٹا کام کر کے اپنا گھر چلانا ہوتا ہے۔ بھارت میں تعلیم میٹرک لیول تک مفت ہونے کے باوجود اتنی مہنگی ہے کہ اسے تعیش شمار کیا جاتا ہے جس کو Afford کرنے کی عام خاندان اہلیت نہیں رکھتا۔

۵۔ نیچے معیار رہائش کی وجہ

گھر، لباس پوشاک اور گھر کے سامان کسی کے معاشی حالات کی منہ بولتی تصویر ہوتے ہیں۔ شہری اور دیہی آبادیوں میں مسلمانوں کے 70 فیصد مکانات مٹی اور پھونس کے بنے ہوتے ہیں یا چھت کے نام پر بورا، سن یا پھر پلاسٹک کی چادر ٹنگی ہوتی ہے۔ جس میں بیت الخلاء اور پینے کے پانی کا نظم نہیں ہوتا۔ کھانے اور پکانے کے چند ٹوٹے پھوٹے برتنوں کے علاوہ کوئی اور اثاثہ نہیں ہوتا۔ بچھاون کے نام پر کھردری چارپائی یا چٹائی ہوتی ہے۔ 90 فی صد لوگوں کے پاس گھر کے علاوہ کوئی دوسری زمین نہیں ہوتی۔ جاڑے اور گرمی کے اثرات سے بچنے کے لئے مناسب کپڑے بھی میسر نہیں ہوتے۔ اس بھیانک غریبی اور تنگی کے ماحول میں قومی شعور کی بیداری کیسے ممکن ہے؟

۶۔ قرض کا جال

ہمارا سماج روایتی سماج ہے جس میں وسائل ہوں یا نہ ہوں بعض رسومات کی ادائیگی لازمی سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا لوگ اس کو قرض بلکہ سودی قرض لے کر بھی پورا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ عام طور پر وسائل کی کمی کی وجہ سے بیماری اور شادی کے وقت لوگ قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور جب ایک بار مہاجن کے چکر میں پھنس جاتے ہیں تو پھر زندگی بھر اس سے نکلنے کی راہ نہیں پاتے۔ اگرچہ ملک میں بینکوں کا جال بچھ گیا ہے پھر بھی 80-70 فی صد دیہی قرضوں کا لین دین غیر بینکنگ سکٹر میں ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مہاجنی سسٹم اپنے تمام تر استحصالی داؤ پیچ کے ساتھ علیٰ حالہٖ قائم ہے۔ بینکنگ قرضوں کا عام رجحان صاحب وسائل لوگوں کو ہی وسائل فراہم کرتا ہے۔ جو لوگ واقعی غریب اور ضرورت مند ہیں ان کو بینکوں سے قرضہ نہیں مل پاتا ہے۔ اس لئے وہ مجبوراً مہاجنوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو ان کے تھوڑے سے اثاثے کو گروی رکھ کر بھاری شرح سود پر قرض دیتے ہیں۔ جس سے نکلنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے۔ آج بھی دیہی آبادی کے منظر نامہ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔

۷۔ تلک جہیز کا مسئلہ

مسلمانوں کے سماجی مسائل میں جو مسئلہ اس وقت سب سے زیادہ خطرناک اور اژدھا کی طرح پھن پھیلائے پورے سماج کو ڈسنے کے لئے تیار ہے وہ تلک جہیز کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ اپنے اندر اتنی پیچیدگی رکھتا ہے کہ علماء اور واعظین کی لاکھ تقریروں کے باوجود اس کی سنگینی گھٹنے کے بجائے بڑھتی ہی چلا جا رہی ہے۔ آئے دن اس کے خلاف فتوے دئے جا رہے ہیں لیکن مسئلہ جوں کا توں بنا ہوا ہے۔ بسا اوقات فتویٰ دینے والے حضرات اور اس کے خلاف مہم چلانے والے لوگ بھی حلق حلق تک اس بگاڑ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ مسئلہ کا سب سے کریہہ اور کربناک پہلو یہ ہے کہ اکثر لوگ بیٹی کی شادی کے لئے اور اس کو تلک جہیز دینے کے لئے بھیک مانگتے اور دست سوال دراز کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو اس کو پیشہ بنا لیا ہے۔

سے گھروں میں تلک جہیز فراہم نہ کر سکنے کی وجہ سے بیٹیاں ادھیڑ عمر کو پہنچ چکی ہیں جوان کے والدین کو زندہ درگور کئے دے رہا ہے۔ تلک جہیز کی لعنت کے برے اثرات کی وجہ سے غیر مسلم سماج کی طرح مسلم سماج میں بھی بیٹیوں کی پیدائش کو زحمت سمجھا جانے لگا ہے اور بیٹیوں کی پیدائش پر والدین اور دیگر رشتہ داروں یہاں تک کے خود گھر کی عورتوں کے چہروں پر کلونس چھا جاتی ہے۔ مسلمان سماج میں سود، گھوس خوری اور دیگر قبیح معاشی اعمال کے در آنے کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔

جو مسئلہ اتنا سنگین اور پیچیدہ ہے اس کو محض وعظ و نصیحت یا فتوے کے زور پر ختم نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کے اسباب کا گہرائی میں جا کر جائزہ لینا ہوگا۔ اور اس کے لئے ایک ایسا قابل قبول حل ڈھونڈھنا ہوگا جو مسئلہ کی نوعیت کو بدل دے۔ میری نظر میں اس مسئلہ کے کئی پہلو ہیں۔ لہٰذا اس پر ہر طرف سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ مروجہ ہندو سماج میں تلک جہیز کو کوئی قبیح فعل نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ ایک مقبول عام رائج عمل ہے جس کو پوری سماجی قبولیت (Universal Social Acceptibility) حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کے ذریعہ انسداد تلک اور جہیز قانون کی ترویج، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلوں کے باوجود شاید ہی کبھی کہیں اس قانون پر کوئی عمل ہوتا ہے۔ بلکہ وزراء سفراء، جج صاحبان، افسران، وکلاء، صحافی اور سماج کے ہر طبقے کے لوگ خوشی خوشی جہیز لیتے اور دیتے ہیں۔ بلکہ جہیز اور تلک کے بغیر شاید ہی کسی شادی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس باب میں جو قانون سازی کی گئی ہے وہ محض دکھاوے (Cosmetic Exercise) کے لئے ہے تاکہ قوموں اور ملکوں کے درمیان خود کو قانون سازی کی حد تک لبرل، پروگریسو اور جنڈر جسٹس اور ایکیولیٹی کا حامی دکھایا جا سکے۔ دراصل تلک جہیز کو عزت کی علامت (Status Symbol) مانا جاتا ہے۔ اس لئے یہ قبیح رسم پوری شدت اور تابانی کے ساتھ رائج ہے۔ مسلم سماج میں جو لوگ ہندو سماج سے جتنا زیادہ قریب ہیں ان کے اندر یہ رسم اتنی ہی شدت کے ساتھ رائج ہے۔ اس معاملہ میں ہندو ایلیٹ اور مسلم ایلیٹ کا کلچر ایک جیسا ہے۔ لہٰذا تلک جہیز کی حد تک مسلم کلچر اور ہندو کلچر میں کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمان سماج کا پورا منہاج ہی تبدیل ہوگیا ہے اور شادی بیاہ کے معاملہ میں دین و تقویٰ کے بجائے مادی معیارات کو زیادہ اہمیت دی جارہی ہے۔ نتیجہ کے طور پر بیٹی کا دولہا بازار کی جنس ہوگیا ہے جس کو بڑے مول دے کر خرید کر گھر لانے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی کی کمی ہے۔ ان کے اندر کم حوصلگی پائی جاتی ہے۔ سخت کوشی اور محنت سے جی چراتے ہیں۔ جوکھم اٹھانا نہیں چاہتے، لالچ اور ہوس عام ہے۔ مصنوعی معیارِ زندگی کے دلدادہ ہیں، دوسروں کی دیکھا دیکھی کرنے کا رجحان عام ہے۔ وہ متعدد نفسانی امراض کے شکار ہیں جن میں احساس کمتری عام ہے۔ اس لئے راتوں رات بغیر کچھ کئے کرائے لکھ پتی بن جانا چاہتے ہیں اور اپنے گھر کو تعیش کے سارے سامانوں سے پُر کر لینا چاہتے ہیں، چاہے بعد میں اس کا سنبھال پانا ان کے لئے کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔ یہ سب کچھ آسانی سے تلک جہیز کے ذریعہ پورا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اپنی تمام تر قباحتوں کے باوجود اس رسم کو ہر کس و ناکس اپنے خون جگر سے سینچ رہا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے مسلمانوں میں برادری کی عصبیت کچھ اتنی بڑھ گئی ہے کہ پوری کمیونٹی کئی آبی خانوں (Watertight compartments) میں تقسیم ہوگئی ہے جن کے درمیان کوئی Mobility نہیں ہے۔ لہٰذا لوگ گوشت پوست اور ہڈی کے چکر میں اس قدر پھنسے ہوئے ہیں کہ اپنی بیٹیوں کو اپنے فرقہ اور ذات سے باہر بیاہنے کو تیار نہیں ہوتے۔ لڑکے والے بھی یہی کرتے ہیں۔ چونکہ اچھے لڑکوں کا قحط ہے اس لئے لوگ پیسے لے کر گھروں سے نکلتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ دام دے کر اپنی برادری کے لڑکوں کو خریدنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پانچویں اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم اور معاش کا تناسب اتنا کم ہے کہ جہاں کوئی اچھا لڑکا نظر آیا لوگ اس کی جانب دوڑ پڑتے ہیں۔ معاشیات کا اصول عام یہ ہے کہ جب رسد طلب سے کم ہوتی ہے تو قیمت بڑھ جاتی ہے۔ چونکہ معاشرے میں تعلیم یافتہ اور برسر روزگار نوجوانوں کی کمی ہے اس لئے لوگ بڑھ چڑھ کر بولی لگاتے ہیں اور اس طرح تلک جہیز کی رسم بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ بسا اوقات بن مانگے ہی لوگ اتنا آفر کر دیتے ہیں کہ ان کے

لئے انتخاب کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جہاں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید حسب خواہش مال نہ ملے وہاں لوگ منہ کھول کر مطالبہ کرتے ہیں۔ اس طرح یہ وباء چھوت کی بیماری کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہے۔ جب کسی برائی کو قبول عام حاصل ہو جاتا ہے تو وہ معیوب نہیں سمجھی جاتی پھر اس میں عوام و خواص سب ملوث نظر آتے ہیں۔ ویسے یہ برائی سماج کے بڑے لوگوں کی پیدا کردہ ہے اس لئے چھوٹے لوگ اس کو بڑوں کا چلن سمجھ کر اپنانے میں کوئی خاص قباحت محسوس نہیں کرتے۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں بے روزگاری عام ہے۔ کسی زمانے میں ان کے پاس اچھی خاصی زمین جائداد ہوتی تھی یا وہ کسی کاروبار سے جڑے ہوتے تھے۔ امتداد زمانہ نے ان سے زمینیں چھین لیں اور ان کا کاروبار بھی ٹھپ پڑ گیا ہے۔ لہٰذا اوسط تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کوئی روزگار نہیں ملتا۔ بے کاری میں شادی دوہرے وبال کی طرح ہے۔ اس لئے بہت سے لوگ تلک جہیز کو اپنی معاش کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اور اس سے حاصل شدہ رقم سے کوئی دوکان یا کاروبار شروع کرتے ہیں۔

اگر آپ ان تمام وجوہات کا بہ نظر غائر جائزہ لیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ایک دو سماجی عوامل کے علاوہ یہ سارا مسئلہ غربت اور مال کی کمی کا ہے۔ اور ان لوگوں کے لئے یہ مسئلہ سوہان روح بنا ہوا ہے جن کے پاس وسائل کی کمی ہے۔ جو لوگ مالی فراغت رکھتے ہیں ان کے لئے یہ مسئلہ اتنی سنگینی اور پیچیدگی نہیں رکھتا۔ لہٰذا میرے نزدیک اس مسئلہ کے حل کے لئے دوطرفہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف دینی شعور کی بیداری کے ذریعہ لوگوں کو اس مسئلہ کی صحیح نوعیت سے آگاہ کرنا چاہئے اور بتانا چاہئے کہ اسلام میں ایک تو عورت اور اس کے والدین پر کوئی مالی بوجھ ڈالنے کی اجازت نہیں ہے، کفالت اور دیگر ذمہ داری مرد کا حصہ ہے۔ اس لئے یہ بات مزاجِ شریعت سے میل نہیں کھاتی۔ دوسری طرف مسلمانوں کو حصول مال کی جدوجہد پر آمادہ کرنا چاہئے تاکہ وہ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلوا سکیں۔ اور یہ تعلیم انہیں معاشی لحاظ سے فارغ البال بنانے میں مددگار ہو۔ اس ضمن میں لڑکیوں کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ لڑکیاں بوجھ کے بجائے اثاثہ بن سکیں۔ لہٰذا اس مسئلہ کے حل کے لئے پہلی ضرورت ذہنیت کی اصلاح ہے اور

دوسری ضرورت مال کی فراہمی ہے۔

ایک بات میں تمام مصلحین اور واعظین کی خدمت میں ادب کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ عربی سماج اور ہندوستانی سماج کے فرق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ عربوں کے یہاں کثرت ازدواج عام ہے جبکہ ہندوستان میں یہ شاذ ہے۔ شادی ایک بار ہوتی ہے اور یہ زندگی بھر کا عمل ہے۔ شادی سادگی کے ساتھ تو ہو لیکن خوشی خوشی کی طرح منائی جانی چاہئے۔ لہٰذا میری رائے میں شادی حیثیت کے مطابق حوصلے سے کی جانی چاہئے۔ کوئی سماج انتہا پسندی کو پسند نہیں کرتا۔ انتہا پسندی کبھی قبول عام حاصل نہیں کرتی۔ اس لئے نہ تو بے جا اسراف صحیح ہے اور نہ ایسی سادگی جس پر بخل و مردنی کا گمان ہو۔ اس افراط و تفریط کے درمیان اعتدال کی راہ ہی صحیح سیدھی راہ ہے۔ لہٰذا ہمارے علماء اور واعظین کو ظاہری الفاظ پر ہی نہیں حالات و ظروف پر غور کرتے ہوئے ایسا اندازِ نظر اختیار کرنا چاہئے جو ایک طرف روح شریعت کے قریب ہو اور دوسری طرف سماج میں قبول عام حاصل کر سکے۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ کے قابل قبول حل کے لئے مسلمانوں کو پیش در پیش حصول معاش پر آمادہ کیا جائے تاکہ اچھے لڑکوں اور اچھی لڑکیوں کی طلب و رسد میں جو تفاوت ہے وہ دور ہو۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بڑی حد تک اس مسئلہ کی سنگینی کم ہو جائے گی۔ لہٰذا تلک جہیز کو میں ایک سماجی اور معاشی مسئلہ مانتا ہوں۔ صرف سماجی مسئلہ نہیں۔ اس لئے اس کا سماجی اور معاشی حل ہی ہو سکتا ہے۔ کوئی دوسرا حل نہیں۔

۸۔ قومی وقار میں گراوٹ کی بڑی وجہ معاشی تنگی ہے

کسی قوم کی سماجی و سیاسی حیثیت اس کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے متعین ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی بے وقعتی کی بڑی وجہ ان کی تعلیمی اور معاشی پس ماندگی ہے۔ اس صورتحال سے نکلنے کے لئے جہاں ایک طرف ملی اور دینی شعور کا احیاء اور اتحاد و یک جہتی ضروری ہے وہیں دوسری طرف تعلیمی اور معاشی بہتری بھی ضروری ہے۔ مسلمانوں کے وہ فرقے اور گروہ جو تعداد میں بہت کم ہیں مگر معاشی لحاظ سے مضبوط ہیں جیسے بوہرہ، خرجہ، اسماعیلی اور کچھی میمن وغیرہ وہ مسلمانوں کے دوسرے گروہوں کے مقابلے زیادہ با اثر سمجھے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ لوگ اپنی

برادری کے کمزور عناصر کی جس طرح خبر گیری کر پاتے ہیں باقی لوگ نہیں کر پاتے ہیں۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک ہم معاشی لحاظ سے بہتر اور خوشحال نہیں ہوں گے ایک تو یہ کہ اپنی بے وزنی دور نہیں کر سکتے ہیں دوسرے اپنے لوگوں کی ٹھیک سے مدد بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہندوستان کے مخصوص تناظر میں معاشی بہتری کی کوشش کرنا قومی عزت کی بحالی کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا اس پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

معاشی تنگی جیسا کہ ایک اردو شاعر نے کہا

مفلسی ہر بہار کھوتی ہے مرد کا اعتبار کھوتی ہے

یعنی اس کے عزت نفس پر چوکے لگاتی ہے۔ وہیں اس سے کرائسس مینجمنٹ کی صلاحیت بھی چھین لیتی ہے۔ ایک شخص کو کوئی بیماری لاحق ہو یا کوئی سماجی مسئلہ درپیش ہو، اگر اسے معاشی فراغت حاصل ہے تو وہ اس مسئلہ پر آسانی سے قابو پا لیتا ہے۔ لیکن اگر اسے معاشی تنگی کا سامنا ہو تو مسائل کی شدت میں سو گنا اور ہزار گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ معاشی تنگی نہ صرف یہ کہ اس کا جوہرِ کردار چھین لیتی ہے بلکہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پر قفل لگ جاتا ہے۔ اسے سارے دروازے بند لگنے لگتے ہیں۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ غربت ہزار بیماریوں کی ایک بیماری ہے بلکہ سب سے بڑی بیماری ہے۔ اس لئے پوری تندہی سے اس کا علاج ڈھونڈھنا چاہئے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ معاملہ فرد کا ہو یا سماج کا پوری انسانیت کا ہو یا کسی مخصوص گروہ کا، معاش ایک ایسی لازمی بنیادی ضرورت ہے جو باقی ہر ضرورت پر حاوی ہے۔

لہٰذا اس کی مرکزی اہمیت کے پیش نظر اس پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

۹۔ معاش اور مروجہ تصوف

مجھے اس پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ اتنی بدیہی حقیقت کے باوجود لوگ معاش اور معاشی عمل کو وہ اہمیت کیوں نہیں دیتے جو اس کا حق ہے۔ مجھے سب سے زیادہ تعجب ان علماء اور مشائخ پر ہوتا ہے جو توکل کی غلط تعلیم دیتے ہیں اور دنیا اور معاشی معاملات کو حقیر شمار کرتے ہیں۔

انہوں نے زوال یافتہ مسلمان سماج میں دنیا سے بے رغبتی کا ایسا رجحان پیدا کیا ہے جس کے نتیجے میں جائز راستے تو مسدود ہو گئے ہیں لیکن معاشی ضرورت کی منہ زوری جب انہیں مجبور کرتی ہے تو وہ ناجائز راستوں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ بھائیوں اور بہنوں کی جائداد ہڑپ کر جانا، یتیموں کے مال پر غاصبانہ قبضہ کرنا، خاندان کے مجوبین کو بے یار و مددگار چھوڑ دینا، وقف کی جائداد پر ناجائز قبضہ، امانتوں کا زیاں وہ کون سی معاشی برائی ہے جو مسلمانوں میں بالخصوص ان کے نام نہاد دین دار حلقوں میں نہیں پائی جاتی۔ کچہریوں میں داڑھی ٹوپی اور شرعی پاجامہ والے لوگ جس کثرت سے نظر آتے ہیں شاید ہی کسی دوسری جگہ نظر آئیں۔ اور یہ سب کے سب جھوٹے مقدمات میں پھنسائے نہیں گئے ہیں بلکہ ان کی اکثریت قانونی داؤ پیچ کے ذریعہ صحیح وارثین کو ان کے حق سے محروم کرنے کے لئے غازی اور مجاہد کے لباس میں سرگرم عمل نظر آتی ہیں۔

جب مسلمان عرب کے صحرا سے باہر نکلے اور دنیا کی مختلف دینی تہذیبوں سے ان کا سابقہ ہوا، ان کی وہ Purity جاتی رہی اور کئی دوسرے اثرات پیدا ہوئے۔ خاص طور سے مسلمانوں کو رومی، ایرانی اور ہندی تہذیب و ثقافت نے متاثر کیا اور عیسائی اور ہندو تصوف چور دروازے سے اسلامی تصوف میں داخل ہو گیا۔ جس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کارگاہِ عمل کی جگہ عقوبت خانہ سمجھی جانے لگی جس سے فرار میں ہی نجات ہے۔ لہٰذا لوگوں نے ترک دنیا کی روش اختیار کی اور اپنے آپ کو ان اعمال و مشاغل میں مصروف رکھنا شروع کیا جس میں ان کو معاشی عمل کے لئے کوئی وقت ہی نہیں ملتا۔ لوگوں نے اس طرزِ عمل کو آئیڈیل بنا لیا اور غیر شعوری طور پر ایسے اعمال و معاملات کے لئے لوگوں کے دلوں میں عقیدت پیدا ہونے لگی۔ اس فکر کے ابتدائی متبعین تو اخلاص و عمل کے پیکر تھے لیکن بعد کے لوگوں نے عوام کی عقیدت و محبت کو پونجی سمجھ لیا۔ اب چاہے مرید کتنا ہی پھٹے حال ہو پیر کی زندگی عیش و عشرت سے گذرنے لگی کیونکہ تحفوں اور نذرانوں سے ان کو اتنا مال مل جاتا تھا کہ وہ نوابوں اور رئیسوں کی طرح زندگی گذار سکیں۔ عوام کے لئے جو مال وبال تھا وہ ان دنیا دار پیروں کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ اقبال نے اپنی ایک نظم باغی مرید میں کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر میر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

اس نے عوام سے سخت کوشی کے جوہر تو چھینے لیکن کردار کی اصابت نہیں ادا کی۔ اس رجحان نے سماج کو دو خانوں میں بانٹ دیا۔ ایک گروہ وہ تھا جس نے معاشی عمل کو بہتر نہیں سمجھا اور خود پر تنگ دستی و عسرت عائد کر لی اور دوسرا گروہ وہ تھا جو ہر قید سے آزاد ہوس مال میں مبتلا ہو گیا۔ اس کا سب سے خراب پہلو یہ نکلا کہ پہلا گروہ دوسرے گروہ کا دست نگر بن گیا جس کے نتیجے میں دوسرے گروہ کو اس کی تمام تر حرام کمائیوں کے باوجود یک گونہ قبولیت واحترام حاصل ہونے لگا۔ اس میں وہ دین دار گروہ پس گیا جو ان دونوں فکر کو غلط خیال کرتا تھا۔ اس طرح دین وشریعت کا چلن معاشرے میں کمزور سے کمزور تر ہونے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بیس کڑور کی آبادی ہونے کے باوجود اسلام اس دیس میں اجنبی ہے۔ اس وقت اسلام اور اسلامی شریعت کو کسی بھی معانداور دشمن گروہ سے زیادہ مسلمانوں سے خطرہ ہے جنہوں نے اس دین کو ماننے کے باوجود اس پر من حیث القوم عمل کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

مسلمان سماج اس وقت جتنے فکری اور عملی تضادات کا شکار ہے شاید ہی کوئی دوسری قوم اتنے تضادات میں گرفتار ہو۔ اس لئے مسلمانوں میں یکسوئی اور اعتدال پیدا کرنے کے لئے صحیح نہج پر ملت کو دوبارہ استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ انسانی زندگی معاش اور معاد سے عبارت ہے۔ لہٰذا ان دونوں میں اعتدال وتوازن پیدا کرنے کیلئے صحیح دینی ثقافت کا فروغ ضروری ہے جس کے لئے مسلم سماج کو غیر اسلامی اثرات سے پاک کر کے خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر لانا ضروری ہے۔ یہ کام نئی حکمت اور نئی تحریک چاہتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں میں صحیح اسلامی نہج پر ایک زبردست معاشی تحریک کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ □ □

باب سوم

مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی کے اسباب

مسلمانوں کی معاشی پس ماندگی کے بعض تاریخی، سیاسی، تعلیمی اور نفسیاتی عوامل بھی رہے ہیں جن کا معروضی مطالعہ ضروری ہے تاکہ اس کا صحیح تدارک کیا جا سکے اور مسلمان اس تاریخی مکر کے جال سے باہر نکل سکیں۔

ا۔ تاریخی اور سیاسی اسباب

ہندوستانی مسلمان پچھلے تین سو سال سے ایک ایسے تاریخی گرداب میں پھنسے ہیں جس سے نکلنے کی اب تک کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ انگریز جس وقت ہندوستان میں آئے اس ملک کے طول وعرض پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔ مسلمان سیاسی، معاشی، تعلیمی اور عسکری اعتبار سے غالب قوت تھے۔ حکمراں طبقے کے علاوہ جاگیردار، زمیندار، صاحب حیثیت اور صاحب ثروت لوگوں کی اکثریت مسلمان تھی۔ مسلمان تاجر، صناع، سپاہی اور کاریگر تھے۔ ان کا شمار ایک مہذب اور تعلیم یافتہ قوم میں ہوتا تھا۔ انگریزوں نے جب مسلمانوں سے اقتدار چھینا تو ان کی معاشی اور تمدنی کمر توڑنے کے لئے ضروری سمجھا کہ ملک کے معاشی اور تعلیمی نظام میں ایسی تبدیلی لائی جائے جس سے ان کے لئے ترقی کے مواقع مسدود ہو جائیں۔ چنانچہ اصلاح اراضی کے ذریعہ ان کی زمینیں چھینی گئیں۔ سیاسی وجوہات سے ان کی جاگیرداریاں اور زمینداریاں ختم کی گئیں۔ ان کی صنعتوں کو تباہ کیا گیا اور جدید تعلیم کو رواج دے کر ان کے مروجہ تعلیمی نظام کو تہس نہس کر دیا گیا۔ وہ قوم جو انگریزوں کی آمد سے قبل 85% تعلیم یافتہ تھی ان کی آمد کے بعد 85% جہل کا شکار ہو گئی۔ سرکاری پالیسی کے تحت سرکاری اداروں میں مسلمانوں کو نوکریوں سے محروم رکھا گیا۔ غرض ہر طرف سے ان کی پیٹھ پر کوڑے برسائے گئے اور وہ مضمحل اور نڈھال ہو گئے۔

جب جنگ آزادی کی لے تیز ہوئی اور اکثریتی اقوام کی طرف سے چیلنج بڑھا تو انگریزوں نے دوسری چال چلی اور ان دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے مد مقابل لا کھڑا کیا جس کو پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کا کچھ خاص بھلا تو نہیں ہوا لیکن دونوں اقوام کے درمیان نفرت اور تشدد کی ایسی آگ بھڑکی جو تقسیم ملک پر منتج ہوئی۔ اس کے باوجود وہ آگ اب تک سلگ رہی ہے بلکہ کبھی کبھی بھیانک رخ اختیار کر لیتی ہے۔ آزاد ہندوستان میں سرکاری مشنری کی بے مہری، اہل سیاست کی دسیسہ کاری، فسادات و امتیازات نے ملت کا تایا پانچہ کر رکھا ہے اور ہندوستانی مسلمان ایک تباہ حال ملت کے طور پر غربت و ذلت اور مظلومی کی زندگی جینے پر مجبور ہیں۔

بنگلہ دیش بننے کے بعد لوگوں میں تھوڑی ہمت و حوصلہ پیدا ہوا تھا اور اس ملک میں جینے مرنے کا رجحان مضبوط ہو رہا تھا کہ 1992ء میں بابری مسجد کے سانحہ سے ملک میں دستور و عدالت کی موجودگی میں فرقہ پرست قوتوں کا جو ننگا ناچ دیکھنے کو ملا اس نے نازی جرمنی میں ہٹلر کی روح کو بھی شرما دیا۔ تاریخ میں چنگیز، ہلاکو، نادر شاہ اور ایسے نہ معلوم کتنے ظالموں کی داستانیں ہم پڑھتے آئے تھے لیکن ان سب کو جدید ہندوستانی نازیوں نے پیچھے چھوڑ دیا۔ اور ایک بار پھر ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود و بقاء پر ایک سوالیہ نشان لگ گیا۔ ترقی کے لئے پُر امن ماحول ضروری ہے اور جب تحفظ ایک لاینحل مسئلہ بن جائے گا تو اس وقت ترقی کیسے ہو سکتی ہے؟ ملک کی موجودہ صورتحال ہر سنجیدہ محب وطن شہری کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے جس کا تعلق مسلمانوں کی معاشی فلاح سے ہی نہیں بلکہ ملک کا سماجی امن، معاشی بہتری اور سالمیت سب داؤ پر لگا ہے۔ اس کے لئے ہندو اور مسلم قیادت کو سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا اور ایک ایسا لائحہ عمل طے کرنا ہوگا جو ان سماج دشمن اور ملک دشمن طاقتوں کے بڑھتے قدم کو روک سکے اور ان کے عزائم کو ناکام بنا دے۔ یہ اس نامکمل تاریخی جدوجہد کا حصہ ہے جو حصول آزادی کے بعد سے اب تک چل رہی ہے۔ ایک پر امن اور خوش حال ہندوستان کا خواب جو سب کا ہندوستان ہے ہندوؤں کا بھی اور مسلمانوں کا بھی۔

۲۔ مڈل کلاس طبقے کا فقدان

تقسیم ملک کے بعد جو نام نہاد مسلمان قیادت تھی اور ان کا تعلیم یافتہ طبقہ جو مڈل کلاس تھا خود حفاظتی کے سبب اور بہتر مستقبل کی تلاش میں پاکستان ہجرت کر گیا۔ اور اس ملک میں بچ گئے چند گنتی کے رہنما، مسجدوں کے ٹوٹے پھوٹے لوٹے غریب اور کم پڑھے لکھے مسلمان عوام۔ لیکن اللہ نے اس ملت کو بہت سخت جان بنایا ہے۔ آزادی کے فوراً بعد اتر بھارت کے بڑے حصے میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ مسلمانوں کی بستیاں قصبات اور شہر تباہ ہو گئے۔ بیشتر مقامات سے ان کے پاؤں اکھڑ گئے پھر بھی لوگوں نے اپنے ٹوٹے پھوٹے گھروں کو سمیٹا اور ایک نئی ہمت کے ساتھ اپنی تعمیر میں جُٹ گئے۔

فسادات آفات سماوی کی طرح معمول بن گئے اور لوگوں نے ان خطرات کے ساتھ جینا سیکھ لیا۔ ان کی سخت جانی ایک طرف لیکن دوسری طرف سرکاری پالیسی اور حکومت کا رویہ ان کو آگے بڑھنے سے روکتا رہا۔ مسلمانوں میں تعلیم عام نہ ہو اس کے لئے انگریزوں سے سیکھے سبق کو دہرایا گیا۔ ان کی زبان، ثقافت، دین، شریعت اور تاریخ کو مٹانے اور مسخ کرنے کی چال چلی گئی۔ اس طرح کی ہر کوشش مسلمانوں کو تعلیمی اداروں سے دور کرنے لگی۔ مسلمانوں میں خود اتنے وسائل نہیں تھے کہ حکومت کے تعاون کے بغیر اپنی نئی نسلوں کی تعلیم کا بھرپور انتظام کر سکتے۔ لہٰذا مسلمان تعلیمی میدان میں پچھڑتے چلے گئے۔ سرکاری نوکریوں کے دروازے کچھ تو ان میں مسابقت کی صلاحیت نہ رکھنے کی وجہ سے بند رہے اور اگر کہیں انہوں نے اپنی اہلیت اور سخت جانی کا ثبوت دیا بھی تو ایک نا تحریر شدہ ضابطے کے تحت ان کو ان سے دور رکھا گیا۔ فوج، پولس اور انتظامیہ میں ان کو آگے بڑھنے سے باضابطہ روکا گیا۔ زراعت، صنعت اور تجارت بڑی حد تک ان کے ہاتھ سے چھن چکی تھی۔ کچھ روایتی صنعتیں جو ان کے ہاتھ تھیں ان کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ نتیجہ کے طور پر وہ صنعتیں بازار کی مسابقت کا مقابلہ نہ کر سکیں اور دھیرے دھیرے ختم ہو گئیں یا ختم ہو رہی ہیں۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ تعلیم، معاش، سرکاری نوکری، صنعت، تجارت اور زندگی کے دیگر شعبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی صفر سے کچھ زائد ہے۔ جبکہ مسلمان اس ملک کی آبادی کا

12.5% ہیں 65% مسلمان غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گذار رہے ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیم 35% ہے سرکاری نوکریوں میں ان کا تناسب 1.5% ہے۔ گوپال سنگھ کے مطابق یہ اس ملک کی سب سے پس ماندہ ترین آبادی ہیں۔ اس کے بعد بھی ہمارے سیاست دانوں اور پالیسی ساز لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اس وقت بہار میں ایک ایسی پارٹی کی حکومت ہے جو اپنے آپ کو مسلمانوں کا دوست اور محافظ قرار دیتی ہے اور اپنے اقتدار کے لئے مسلمانوں کی احسان مند ہے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو فرقہ پرست قوتوں کی پھبتیاں اور گالیاں سننی پڑتی ہیں۔ لیکن اس حکومت نے بھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ یہ حکومت کہتی ہے کہ اس کی سرکار MY کے کمبی نیشن سے بنی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ بتایا جائے کہ M کا مان (Value) کیا ہے۔ تب یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اس مان کے مطابق مسلمانوں کو ان کا حصہ رسدی ملا یا نہیں۔ یا یہ محض ایک پولیٹیکل اسٹنٹ ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو بے وقوف بنانا اور اپنا الو سیدھا کرنا ہے۔

۳۔ نئی پہل کی ضرورت

آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی اب تک کی تاریخ غربت اور محرومی کی تاریخ رہی ہے اور ابھی بھی اس لمبی تاریک سرنگ سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ حالات انتہائی سنگین ہیں۔ لہٰذا انفرادی پہل سے معاملہ حل نہیں ہوگا اس کے لئے کمیونیٹی پہل چاہئے جو مشترکہ جدوجہد کا متقاضی ہے۔ لہٰذا ملت کے ارباب حل وعقد کو سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا اور ملت کے معاشی ایجنڈے اور معاشی مسئلے پر ایک واضح لائحہ عمل طے کرنا ہوگا۔ جس کے لئے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی، نفسیاتی باز آبادکاری اور معاشی تنظیم نو ضروری ہے۔

ہندوستان کی موجودہ معیشت کئی طرح کی پیچیدگیوں کی شکار ہے۔ لہٰذا ان پیچیدگیوں کو سمجھتے ہوئے جدید تقاضوں کے تحت ایک ایسی تعلیمی اور معاشی پالیسی وضع کرنی ہوگی جو ایک طرف ملت کے بڑے طبقہ کو سمولے اور دوسری طرف جدید چیلنج کا مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ معاشی طور سے مضبوط قوم ہی اپنے حال اور مستقبل کی اچھی طرح خبر گیری کرسکتی ہے۔ ذیل کی بحث میں ان نکات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ □□

باب چہارم

مسلمانوں کی معاشی بہتری کی راہیں

۱۔ ملت کی نفسیاتی باز آبادکاری کی ضرورت

مسلمانوں کی معاشی بہتری کی راہ میں سب سے پہلا قدم ملت کی نفسیاتی باز آبادکاری Psychological Rehabilitation ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو ہر وقت اور ہر جگہ جان و مال کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ ملک کی ہوا و فضا ایسی بنائی گئی ہے اور ایسی بنائی جاتی رہی ہے کہ کسی وقت اور کہیں بھی ایک چھوٹا سا معمولی اور مقامی واقعہ کسی بڑے فساد کا پیش خیمہ بن جاتا ہے جہاں دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں کروڑوں کی املاک تلف ہو جاتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ فسادی گروہ پوری منصوبہ بندی کے ساتھ پہلے سے موجود ہوتا ہے جہاں کوئی چھوٹا سا واقعہ ہوا وہ اپنے پورے سازشی منصوبے کے ساتھ سرگرم عمل ہو جاتا ہے اور پوری کی پوری آبادی کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ اس میں پولس اور انتظامیہ کی سرد مہری اور جانب داری، اہل سیاست کی پشت پناہی، پریس کا غیر محتاط رویہ اور حکومت کی نا اہلی معصوم نہتھے اور بے قصور لوگوں کے لئے موت اور تباہی کا پیغام لاتی ہے۔ فسادات میں بالعموم جان کا نقصان کم ہوتا ہے۔ لیکن مال کا نقصان زیادہ ہوتا ہے بلکہ فسادات بسا اوقات مسلمانوں کی معاشی کمر توڑنے کے لئے کرائے جاتے ہیں۔ اس لئے زیادہ تر فسادات انہی جگہوں پر ہوتے ہیں جہاں مسلمان معاشی لحاظ سے کچھ بہتر ہیں۔ اور بیشتر وہی علاقے فسادات کے لحاظ سے حساس مانے جاتے ہیں۔ فسادات کا اپی سنٹر (Epi Centre) بالعموم شہری اور صنعتی علاقے ہیں۔ دیہی علاقوں میں اس کا وقوع بہت کم ہوا ہے۔ فسادات کا خوف مسلمانوں کو کھل کر کام کرنے نہیں دیتا۔ وہ شہروں میں ایسی جگہوں پر دوکان، مکان، صنعت، تجارت، کارخانے وغیرہ کھولنے، لگانے اور بنانے سے ڈرتے ہیں جہاں کثیر غیر مسلم آبادی ہے باوجود اس کے کہ وہ جگہ معاشی عمل (Economic Activities) کے لحاظ سے بہت مناسب اور نفع بخش

ہے۔ دوسرے وہ ایسی جگہوں پر بستے ہیں یا کاروبار کرتے ہیں جو معاشی عمل کے لحاظ سے اتنی مناسب اور نفع بخش نہیں ہے۔ تیسرے انہیں غیر تجارتی مقامات کے لئے جو قاعدے سے ترقی یافتہ بھی نہیں ہیں کافی قیمت چکانی پڑتی ہے اور جہاں Civic Services کا فقدان رہتا ہے۔ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ ان پر خوف کی نفسیات طاری ہے جس سے نکلنا ان کے لئے مشکل ہے۔ ہر تھوڑے تھوڑے دنوں پر ملک کی ہوا و فضا کو بگاڑنے اور گرم کرنے کی جس طرح کوشش کی جاتی ہے اس کا ایک Cumulative Effect مسلم سائکی پر پڑتا ہے اور مسلمان خود کو نفسیاتی طور پر De-estabilised محسوس کرنے لگتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ معاشی ترقی کے لئے پر امن فضا ضروری ہے اور جب تک یہ میسر نہ ہو خوف کے ماحول میں کوئی Investment نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بسا اوقات Community اپنے Full Potential کا استعمال نہیں کر پاتی اور یہ چیز اس کی معاشی بہتری میں رکاوٹ بنتی ہے۔

فسادات اور اس کا اندیشہ یہ اس ملک کی ایک بڑی سماجی حقیقت ہے جس پر مؤثر طور پر روک تو لگائی جا سکتی ہے لیکن ہمارے سیاست داں شاید ایسا نہ کرنے دیں۔ ان کے ووٹ کی سیاست ملک کی فرقہ وارانہ فضا کو گرم رکھنے کی متقاضی ہے۔ اس لئے وہ اپنی ذاتی غرض کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں جس میں فسادات ایک بہت ہی معمولی مگر مؤثر حربہ ہے۔ ہمیں اسی ماحول میں جینا اور مرنا ہے۔ اس لئے ہمیں تین محاذوں پر ایک ساتھ پیش قدمی کرنی چاہئے۔

1. ملت کو خوف کی نفسیات سے باہر نکالنا۔ اس کے اندر خود اعتمادی اور خود حفاظتی کا رجحان پیدا کرنا۔
2. اپنے معاشی عمل کو تیز کرنا اور ملت میں اتحاد و جمعیت کی فضا پیدا کرنا۔
3. فرقہ وارانہ خیر سگالی کی فضا بنانے میں پہل کرنا۔ امن، انصاف، بھائی چارہ اور خدمت کے ذریعہ اکثریت کے خاموش مگر انصاف پسند پر امن شہریوں کا دل جیتنا اور مل جل کر اس صورتحال کا تدارک کرنا۔ یہ کام صرف حکومت، اہل سیاست، پولس، انتظامیہ اور پریس پر نہیں چھوڑا جا سکتا ہے بلکہ اس کے لئے عوامی مہم چلانی ہوگی۔ اہل مذاہب جو بالعموم امن

پسند لوگ ہوتے ہیں اور خون خرابے کو پسند نہیں کرتے ان کو جوڑ کر اپنے علاقے اور سماج کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا اور ایسی کسی بھی صورتحال کو بر وقت روکنے کے لئے مشترکہ طور پر تمام مذہبوں کے نمائندوں کو آگے آنا یا لانا۔

ہمیں یہ مان کر چلنا چاہئے کہ حیات و موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک کسی کی موت نہیں آتی دنیا کی کوئی طاقت اسے مار نہیں سکتی۔ لہٰذا ہر شخص تبھی مرے گا جب اس کے رب کی طرف سے بلاوا آئے گا۔ ایسی صورت میں موت سے کیا ڈرنا۔ اور ڈر ڈر کر کیا جینا۔ بزدل آدمی زندہ درگور ہوتا ہے جبکہ بہادر کبھی نہیں مرتا۔ لہٰذا اپنے دلوں سے اس خوف کو نکال دیں اور اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے زندگی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیں۔ موت صرف فسادات سے نہیں ہوتی یا جان و مال کی تباہی صرف فسادات کے وقت نہیں ہوتی۔ موت بستر پر بھی آتی ہے بلکہ زیادہ تر بستر پر ہی آتی ہے۔ حرکت قلب کا بند ہو جانا، ایکسی ڈینٹ، مہلک بیماری یا اور کوئی وجہ۔ جب ہم ان چیزوں سے ڈر کر اپنا کاروبار حیات نہیں سمیٹتے تو صرف فسادات سے ڈر کر ہی کیوں ہم اپنی معاشی جدوجہد سے باز آجائیں۔ ہمیں اس بات پر ایمان ہونا چاہئے کہ اگر اللہ ہماری بھلائی کرنا چاہتا ہے تو ساری دنیا کی قوت مل کر بھی ہمارا نقصان نہیں کر سکتی اور اللہ ہم کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے تو ساری دنیا مل کر بھی ہم کو اس سے نہیں بچا سکتی۔ تو کیوں نہ ہم اللہ ہی پر بھروسہ کریں اور اس کے احکام کے مطابق اپنی حفاظت کا سامان کرتے ہوئے بے خوفی کے ساتھ جئیں۔ جس دن ہم نے موت سے آنکھ مچولی کرنا سیکھ لیا ہمیں ایک نئی زندگی ملے گی۔ پھر ہمارے دلوں سے سارا خوف کافور ہو جائے گا۔ شاید وہ دن ہماری معاشی بہتری کے باب میں سنہرا دن ہوگا۔ بزنس جوکھم سے عبارت ہے جہاں ہر طرح کے نقصانات کو گوارہ کرنے کیلئے آمادہ رہنا چاہئے۔ اس لئے جو لوگ تجارت یا صنعت میں ہاتھ بٹاتے ہیں ان کو Entrepreneur یعنی ساہسی یا باہمت لوگ کہتے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک عملی تجویز یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے مکان، دوکان، تجارت و صنعت کا بیمہ کرانا چاہئے تاکہ آفات زمینی و سماوی مثلاً چوری، ڈکیتی، آگ زنی، لوٹ پاٹ یا ایسے ہی کسی زیاں کے وقت ان کو کچھ سہارا ملے تاکہ دوبارہ وہ اپنا کاروبار شروع کر سکیں۔ پچھلے

دنوں New Assurance of India کے حوالے سے اخباروں میں یہ خبر آئی تھی کہ وہ فسادات سے ہوئے نقصان کا بیمہ نہیں کرتا۔ اگر اُس کی جانب سے اس طرح کا امتیازی سلوک ہوتا ہے تو اس کے ایکٹ میں مناسب ترمیم کرا کے فسادات سے ہونے والے نقصانات کو بھی بیمہ کے دائرے میں لانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کے لئے پارلیامنٹ میں Amendment Bill لانا چاہئے یا عدالت عظمیٰ کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے اور ایسی بیمہ کمپنی بنانی چاہئے جس سے ہر طرح کی آفات وحادثات سے ہونے والے نقصان کی تلافی کی جا سکے۔

مسلمانوں میں اس طبقہ کی کمی پائی جاتی ہے۔ ہمیں اپنی معاشی بہتری کے لئے اس طبقے کو ابھارنا ہوگا اور اس کو ضروری وسائل نیز Protection دے کر آگے لانا ہوگا۔ ہم میں سے ہر شخص ایک دوسرے کا محافظ اور مددگار بن جائے تو اس مسئلہ کو مؤثر طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ امتیازات کا مقابلہ

ہندوستان کے دستور میں یہ بات بڑی وضاحت سے درج ہے کہ اقلیتوں کی نہ صرف یہ کہ زبان، تہذیب، کلچر اور مذہب کی حفاظت کی جائے گی بلکہ زبان، رنگ، نسل، جنس اور مذہب کے نام پر کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک (Discrimination) نہیں کیا جائے گا۔ لیکن زمینی سچائی اس کے برعکس ہے۔ ان کے ساتھ غیر تحریری ضابطے کے تحت امتیاز برتے جاتے ہیں بسا اوقات اس کو ثابت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن کسی چیز کا واضح قانونی ثبوت فراہم نہ کر پانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ ہمارا سماج ذات پات اور فرقہ وارانہ تعصب سے بھرا ہوا ہے اس لئے لوگ نت نئے طریقے سے اس میں سینگ ماری کرتے رہتے ہیں۔ یہ شکایت صرف مسلمانوں کو ہی نہیں ہے بلکہ دیگر طبقات بھی اس کے شاکی رہے ہیں۔ ریزرویشن کی مانگ کے پیچھے سماجی اور معاشی پس ماندگی کے ساتھ ساتھ امتیازی رویہ (Discriminatory Behaviour) بھی ایک اہم محرک رہا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک میں چند باتیں تو بدیہی طور پر واضح ہیں۔ آزادی کے ابتدائی دنوں میں ہوم منسٹری سے ایک سرکلر جاری کیا گیا تھا جس میں مسلمانوں کو حساس اداروں، محکموں اور ذمہ داریوں پر فائز نہ کرنے کی واضح ہدایت دی گئی تھی۔

فوج، پولس اور اعلیٰ انتظامی عہدوں پر مسلمانوں کی نمائندگی یا تو بالکل نہیں ہے یا بہت تھوڑی ہے۔ اعلیٰ مسابقاتی امتحانات میں چند ایک دو مستثنیات کو چھوڑ کر آزادی کے بعد سے اب تک مسلمانوں کا تناسب لگ بھگ ایک جیسا رہا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ ایسے اندیشے Unfounded ہیں یہ صحیح نہیں ہے۔ اس صورتحال کے تدارک کے لئے اور اس کے لئے کہ تقرری کے عمل میں ملت کا اعتماد بحال ہو میرے خیال سے مندرجہ ذیل اقدامات ضروری ہیں۔

❶ مسلمان نوجوانوں میں مسابقت کا رجحان پیدا کیا جائے اور ان کے اندر میریٹ پروموشن اینڈ ڈیولپمنٹ کی کوشش کی جائے۔ ہم گنتی میں کم ہیں اور مسابقت میں کمزور ہوں گے تو ظاہر سی بات ہے ہماری نمائندگی کم ہوگی۔ ہمیں Average نہیں Above Average بلکہ Excellent لوگوں کی ضرورت ہے۔ یہ زمانہ مسابقت اور Excellence کا ہے اس لئے زمانہ کے مزاج اور ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے آگے بڑھنا ہوگا۔ یہ ہدف کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے، اس پر کمیونیٹی لیڈرشپ اور ملت کے نوجوانوں کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہئے اور اپنے اندر وہ جوہر اصلی پیدا کرنا چاہئے جس کو کوئی مات نہ دے سکے۔

❷ تقرری کے عمل کو شفاف، Transparant یعنی پاردرشی بنانے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کا یہ احساس کہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک ہوتا ہے محض وہم نہیں ہے بلکہ اس کا اعتراف ان لوگوں نے بھی کیا ہے جنہوں نے اس امر کی تحقیق کی ہے۔ اس لئے شاید اقلیتی کمیشن کے سابق وائس چیرمین جناب آر۔ سی۔ سکسینہ نے لازمی قرار دیا تھا کہ جب تک انٹرویو بورڈ میں کم از کم ایک اقلیتی نمائندہ نہ ہو اس وقت تک اس تقرری کو Legitimate نہ مانا جائے۔ یہ قدم اقلیتوں میں اعتماد بحال کرنے اور تقرری کے عمل کو شفاف بنانے میں مددگار ثابت ہوگا۔ یہ بھی ایک حقیقیت ہے کہ جس پینل میں کوئی اقلیتی رکن ہوتا ہے وہاں اقلیتوں کی نمائندگی کچھ بہتر ہو جاتی ہے جس سے اس قدم کی اہمیت اور افادیت سمجھ میں آتی ہے۔

❸ ہندوستان میں جو طبقات بعض تاریخی وجوہات سے پس ماندہ رہے ہیں انہیں دستوری طور پر بعض تحفظات فراہم کی گئی ہیں۔ مسلمان اس وقت معاشی، سیاسی، سماجی، تعلیمی اور نفسیاتی

اعتبار سے جس مقام پر پہنچ گئے ہیں اگر انہیں مناسب تحفظات (Protection & Reservation) نہیں فراہم کئے گئے تو ان کا آگے بڑھنا مشکل ہے۔اس لئے مسلمانوں کے ایک حلقہ کی طرف سے ان کو چند برسوں کے لئے خصوصی رعایت دینے اور تحفظ فراہم کرنے کی مانگ کی جارہی ہے۔بد قسمتی سے مسلمانوں کا ایک طبقہ جو خود کو پس ماندہ طبقہ کہتا ہے اس کا مخالف ہے۔اس کی دلیل یہ کہ اگر مسلمانوں کو عمومی تحفظ فراہم کیا گیا تو اس کا سارا فائدہ نام نہاد اعلیٰ طبقہ یعنی مسلمانوں کے وہ افراد لے جائیں گے جو اشراف کہے جاتے ہیں۔اجلاف اور ارذل طبقہ کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔اس لئے ان کا مطالبہ ہے کہ مسلمانوں میں جو لوگ اجلاف یا ارذل طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں صرف انہی لوگوں تک ریزرویشن کی سہولت محدود ہونی چاہئے۔ایک تیسرا طبقہ ہے جو یہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے وہ طبقات جو سماجی اعتبار سے ایسے کام اور پیشوں سے جڑے ہیں جن کو ہندوؤں میں شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کا درجہ دیا گیا ہے۔اس لئے ان کو بھی وہی درجہ اور وہی مراعات دی جائے جو ہریجنوں کو حاصل ہے۔اس لئے کہ سماجی،ثقافتی اور معاشی محاظ سے دونوں کی حیثیت ایک جیسی ہے۔حکومت اور اس کے اہل کار،ماہرین قانون،صحافیوں اور دانش وروں کی ایک جماعت یہ کہتی آرہی ہے کہ ہندوستان میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تحفظ (Reservation) نہیں دیا جاتا ہے۔لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔بلکہ یہ تحفظ صرف اور صرف مذہب کی بنیاد پر حاصل ہے۔کیونکہ ایک ہریجن اگر ہندو سے مسلمان ہوجائے یا کوئی اور مذہب اختیار کرلے تو چاہے اس کی معاشی،تعلیمی،سماجی حالت میں کوئی تبدیلی ہو یا نہ ہو اس کو دی جانے والی ساری تحفظات بیک قلم ختم کردی جاتی ہیں۔اگر یہ تحفظات ان معاشی اور تعلیمی عوامل (Indices) کی وجہ سے ہیں تو جب تک یہ باقی ہیں انہیں یہ تحفظ ملنا چاہئے تبھی یہ کہا جائے گا کہ مذہبی بنیاد پر اس معاملے میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ورنہ واضح طور پر یہ ایک مذہب کو دیا گیا (Protection) ہے اور دوسرے مذاہب کے خلاف ناانصافی ہے جو دستور ہند کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔لہٰذا اس کو Extend کرکے دیگر

مذاہب کے لوگوں کو بھی وہی سہولتیں فراہم کرنا دستور کی اسپرٹ اور انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ابھی حال ہی میں حکومت نے اپنے سابقہ فیصلے میں تبدیلی کرتے ہوئے عیسائی،بدھ اور سکھ دلتوں کو یہ سہولت فراہم کی ہے۔ایسی صورت میں صرف مسلمانوں کو اس سے محروم رکھنا مناسب نہیں ہے۔

رہا یہ سوال کہ یہ ریزرویشن مسلمانوں کے کس طبقہ کو ملنا چاہئے تو اس سلسلے کا پہلا اصولی نکتہ تو یہ ہے کہ حکومت نے ریزرویشن کے لئے جو Para meters طے کئے ہیں یا جن Indices کی بنیاد پر دیگر طبقات کو اس کے دائرے میں لائی ہے کیا مسلمان اس Criteria کے مطابق من حیث القوم اس کے حق دار ہیں یا نہیں؟اب تک کے تمام مطالعات مسلمانوں کو اس درجہ پس ماندہ قرار دیتے ہیں کہ انہیں بحیثیت ملت ریزرویشن ملنا چاہئے۔اس صورت میں اشراف اور اجلاف کی بحث ایک تو غیر ضروری ہے دوسرے مضر ہے۔اور اگر یہ ضروری ہے تو اس کا ایک ورکنگ فارمولہ ڈھونڈھ نکالنا چاہئے۔اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کا ایک قومی کنونشن بلایا جائے اور بند کمرے میں اس پر بھرپور بحث کی جائے اور ایک واضح خاکہ کی روشنی میں مشترکہ مطالبہ ملک اور ارباب حل وعقد کے سامنے رکھا جائے۔اس معاملہ کو دو بلیوں کی ایسی جنگ نہ بنایا جائے جن کو آخر میں سوائے محرومی کے کچھ حاصل نہ ہو اور بندر ان کا سارا حصہ ہڑپ کر جائے۔ہمیں چالاک لوگوں کی سیاست سے باخبر بھی رہنا ہے اور بچنا بھی ہے۔حال کے دنوں میں نئی معاشی پالیسی کے تحت ریزرویشن کی معنویت بڑی حد تک گھٹ گئی ہے۔اس لئے اپنا کیس مضبوطی سے رکھنے کے ساتھ ساتھ اس پر تکیہ کرنے کے بجائے بازار کے تقاضوں کے تحت خود کو تیار کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی منصوبہ بند کوشش کرنی چاہئے۔کمیونیٹی لیڈر شپ کو اس بدلے ہوئے تناظر میں ملت کی ایسی معاشی رہنمائی کرنی چاہئے جو انہیں وقت کے ساتھ آگے بڑھانے میں مددگار ہو۔

۳۔تعلیمی پسماندگی دور کرنے کی کوشش

مذکورہ بالا دو عوامل کا تعلق خارج سے ہے لہٰذا اس ماحول کو بہتر بنانے اور اپنے حق میں سازگار

کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن محض خارجی ماحول کے بہتر ہونے سے سب کچھ ٹھیک نہیں ہو جائے گا اس کے لئے داخلی محاذ پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی ضرورت ملت کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنا اور اس کے اندر تعلیمی بہتری کی کوشش کرنا ہے کیونکہ معاشی بہتری کی تمام سواریاں تعلیمی بہتری کی شاہ راہ سے ہو کر گذرتی ہیں۔ یہ ایک الگ اور وسیع موضوع ہے جس پر الگ سے تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔ ہم صرف اس وقت یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا میں موجود جتنے بھی قدرتی وسائل ہیں اس میں سب سے اہم، قیمتی، لامحدود اور حد درجہ قابل اطمینان انسانی وسائل ہیں جن کو تعلیم کے ذریعہ کسی حد تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ دنیا میں وہی اقوام اور ممالک معاشی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں جہاں انسانی وسائل کا فروغ زیادہ ہوا ہے۔ لہٰذا تعلیمی ترقی معاشی ترقی کی لازمی شرط ہے۔

مسلمانوں میں حروف شناسی کی حد تک 35% لوگ پڑھے لکھے ہیں باقی 65% مرد و خواتین بالکل ان پڑھ اور جاہل ہیں ایسی صورت میں معاشی قفل کا کھلنا ناممکن ہے۔ لہٰذا اس سلسلے کی پہلی ضرورت مسلمان مرد و خواتین میں پرائمری ایجوکیشن کو عام کرنا ہے۔ پس ماندہ طبقات میں تعلیم کو فروغ دینا ہے۔ ان کے اندر ڈراپ آؤٹس کے اسباب کا پتہ لگا کر ان کو روکنے کی کوشش کرنا ہے۔ دوسرے مرحلے میں سکنڈری ایجوکیشن کو معیاری بنانے کی کوشش کرنا ہے اور سکنڈری لیول سے ہی طلباء میں مسابقت کے رجحان کو پیدا کرنا ہے۔ مسلمانوں میں ہر طرح کی تعلیم اور ہر سطح کی تعلیم اور ہر طبقہ کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ٹکنیکل ایجوکیشن، ووکیشنل ایجوکیشن، اعلیٰ فنی تعلیم، سائنسی تعلیم، جدید دور کے بازار کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے مخصوص صنعت و تجارت، مینجمینٹ، ماس کمیونیکیشن، چارٹرا کاؤنٹینسی اور آئی ٹی سیکٹر سے وابستہ تمام طرح کی تعلیم کو عام کرنے کی طرف خاص توجہ دینے کی ضروت ہے۔ مسابقتی تعلیم، جنرل ایڈمنسٹریشن، پولس، عدالت، دفاع، بین الاقوامی تعلقات وغیرہ شعبوں میں جانے کے لئے لائق فائق مردان کار کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح بینکنگ، انشورنس، بین الاقوامی تجارت، اور کیپیٹل مارکٹ کو چلانے کے لئے جس درجہ کے ماہرین کی ضرورت ہے کمیونٹی کو اس کو فراہم کرنا

چاہئے۔ سائنسی علوم، سماجی علوم، ادبیات، سماجیات، فنی اور ثقافتی امور کے ماہرین، قانون دان ریسرچر ایک زندہ کمیونٹی کو سب کچھ چاہئے۔ لہٰذا اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ ملت میں تجارت، صحافت اور سیاست تینوں میدانوں میں ایسے مردان کار چاہئیں جو اپنی شخصی انٹگریٹی، اعلیٰ علمی صلاحیت اور پیشہ ورانہ مہارت کے اعتبار سے مسلمہ معیار تسلیم کئے جاتے ہوں تبھی ملت کا بھلا ہوگا۔

اس سلسلہ میں میں دو چار جملہ مدارس اسلامیہ کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ بہت سے لوگ مدارس اسلامیہ کے موجودہ نظام تعلیم پر طرح طرح سے منھ آتے ہیں اور بزعم خود مدارس اسلامیہ کے نصاب اور ماحول کو بدلنے اور موڈرنائیز کرنے کی بات کرتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنہوں نے کبھی کسی مدرسے میں ایک دن بھی تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ نہ وہ ان مدارس کے مقاصد سے واقف ہیں، نہ مزاج ماحول اور ضروریات سے۔ سیلف اسٹائلڈ مصلح کی حیثیت سے کچی پکی معلومات کی بنیاد پر اپنے مخصوص اسکول کالج اور یونیورسیٹی کے نظام اور نصاب پر بھروسہ کرتے ہوئے مدارس اسلامیہ کو اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کی کوشش نہ تو ملت کے حق میں ہے اور نہ مدارس اسلامیہ کے حق میں اور نہ علم دین کے حق میں۔ بہار میں مدارس کو سرکاری تحویل میں لے کر اور ان کے نصاب میں اسکولوں کے نصاب کو شامل کر کے ایک نئی کوشش کی گئی جس کے نتیجہ میں نہ تو سرکاری مدارس میں پڑھانے والے اساتذہ کو پوری تنخواہ ملی، نہ طلباء کو اچھی تعلیم اور نہ ملت کو اچھے علماء۔ ملا کیا؟ جہلاء کی ایک نئی فوج، انتہائی کرپٹ اور بددیانت افراد کا گروہ اور مدارس کے نام پر کی جانے والی گندی گھناؤنی سیاست۔ وہ مدارس جو سرکاری دست برد سے آزاد محض عوامی چندے، زکوٰۃ، خیرات پر چل رہے ہیں وہاں آپ کو علم بھی ملے گا تقویٰ اور دیانت بھی ملے گی اور ملت کا درد رکھنے والے لوگ بھی۔ اس لئے ملت کو کسی ایسے گروہ کے حوالے نہ کیا جائے جہاں نہ دین ہے نہ علم ہے نہ دیانت ہے۔ لہٰذا میری گذارش یہ ہے کہ روشن خیال افراد اپنی روشن خیالی اُن اداروں اور کاموں تک محدود رکھیں جن میں ان کو مہارت ہے۔ مدارس کو ان صاحبان تقویٰ، دین دار علمائے کرام کے لئے چھوڑ دیں جو

بوریہ نشین ہونے کے باوجود خیالات کی بلندی، کردار کی پختگی، اعلیٰ حوصلگی اور قیادت کے معاملے میں نام نہاد قومی ملی رہنماؤں سے کہیں زیادہ قدآور ہیں۔ مدارس میں کمپیوٹر انٹروڈیوس کرنا، آڈیو ویزول سسٹم لگانا اور جدید تکنیک کے استعمال کو ذریعہ تعلیم میں شامل کرنا اور بات ہے اور اس کے نصاب، مزاج، مقاصد اور منہاج طے کرنا دوسری بات ہے۔

اس لئے دونوں کو گڈ مڈ نہ کیا جائے۔ مصلحین یہ چاہتے ہیں کہ مدارس اسلامیہ بھی ایسے ہی گریجویٹ پیدا کریں جیسے سرکاری کالج اور یونیورسٹیاں پیدا کرتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں ایک وقت وہ بھی آئے گا کہ پھر نہ مسجدوں کے لئے امام ملیں گے نہ مؤذن نہ کوئی نکاح اور جنازہ پڑھانے والا ملے گا اور نہ روزمرہ کے معاملات میں دینی رہنمائی دینے والا۔ اس طرح یہ ملت جدیدیت کے نام پر خود بخود ثقافتی موت مر جائے گی۔ اس وقت اپنی تمام ترکمیوں اور خامیوں کے باوجود مدارس جو غیر اسلامی اثرات اور تحریکات کو بندھ باندھ کر روکے ہوئے ہیں اگر انہیں ہی اصلاح کے سیلاب میں بہالیا جائے تو پھر ملت میں وہ نام نہاد جدید اصلاحات جو مغربی معاشرہ اور دیگر غیر اسلامی معاشروں سے صدیوں سے برآمد کرنے کی کوشش ہورہی ہے، اس کا راتوں رات ایک لامحدود دروازہ کھل سکتا ہے اور اس طرح ملت کو بہت آسانی کے ساتھ کسی دوسرے سماج میں ضم کیا جاسکتا ہے۔ اصلاح کے نام پر یہ کتنا بڑا فساد ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ رہا مسئلہ بے روزگاری کا تو آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ مدارس اسلامیہ کا کوئی بھی فارغ آپ کو بے روزگار نظر نہیں آئے گا اور کم آمدنی میں سلیقے کے ساتھ رہنے کا جو سلیقہ ان کے اندر پایا جاتا ہے وہ بہت کم ہی آپ کو اسکول کالج کے فارغین میں دیکھنے کو ملے گا۔ اس لئے بے روزگاری جدید تعلیم کا مسئلہ ہے مدارس اسلامیہ کا نہیں۔ بہر حال اس سلسلے میں میرا کہنا صرف اتنا ہے کہ اس کام کو دیوبند، مظاہر العلوم، ندوہ، بریلی، سلفیہ، سرائے میر اور اسی قبیل کے دیگر اداروں کے اعلیٰ ذمہ داروں پر چھوڑ دیا جائے۔ جو لوگ اس میدان کے آدمی نہیں ہیں خواہ مخواہ اس میں اپنی ٹانگ نہ اڑائیں۔ دانش وری یہ نہیں ہے کہ جانے انجانے ہر مسئلہ میں اظہارِ خیال کیا جائے بلکہ دانش وری یہ ہے کہ اس مسئلہ میں زبان کھولی جائے جس میں واجبی مہارت ہو۔ ورنہ حدیث کے مطابق

ایسے موقع پر بات کرنے سے چپ رہنا زیادہ بہتر ہے۔

بہر حال یہ جملہ معترضہ تھا۔ تعلیم کے باب میں مندرجہ ذیل امور کی نشاندہی کر کے اپنی بات ختم کرنا چاہتا ہوں۔

1. 6 سے 14 سال کے بچوں کی لازمی تعلیم کا حصول ہندوستان کے قومی مقاصد یعنی دستور کے رہنما اصول میں شامل ہے۔
2. تعلیم کو بنیادی حقوق کے دائرے میں لایا جاچکا ہے۔
3. ملک میں پرائمری سطح سے لے کر سکنڈری سطح کی تعلیم بالکل مفت ہے۔ لڑکیوں کے لئے یہ سہولت گریجویشن تک بڑھادی گئی ہے۔
4. تعلیم کے باب میں پس ماندہ طبقات کو خصوصی انسنٹیو (Incentive) بھی دئے گئے ہیں مثلاً بچوں کو مفت کتابوں کی فراہمی، دن کے کھانے کا انتظام (Mid Day Meal)، ایک روپیہ یومیہ کے حساب سے شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائبس کے بچوں کو مالی مدد۔ اس کے علاوہ اسکالرشپ اور دیگر امداد۔
5. حکومت کی پالیسی کے تحت پرائمری اسکول ایک کیلومیٹر کے ریڈیس میں ہونے چاہئیں۔ اور جہاں چالیس گھر سے زیادہ کی آبادی ہے وہاں ایک پرائمری اسکول کا انتظام ہونا چاہئے۔
6. اقلیتی بچوں بالخصوص لسانی اقلیت کے بچوں کو تیسرے درجے تک اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔
7. دستور کی دفع 25 تا 30 کے تحت لسانی، نسلی، مذہبی اور ثقافتی اقلیتوں کو اپنی زبان، ثقافت اور مذہب کی حفاظت، اشاعت اور ترویج و عمل کو فروغ دینے کے لئے تعلیمی ادارے کھولنے اور اپنے ہاتھوں میں ان کا انتظام و انصرام رکھنے کی اجازت ہے۔

یہ وہ ساری سہولتیں ہیں جو ہمیں دستوری اور قانونی طور پر حاصل ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ عملی

طور پر اس میں بعض مسائل ہیں مثلاً مسلمان آبادیوں میں طے شدہ اصول کے مطابق اسکولوں کا نہ ہونا۔ اردو یونٹ پر غیر اردو داں اساتذہ کی بحالی، مناسب تعداد میں اساتذہ کا نہ ہونا۔ وقت پر اردو درسی کتابوں کی عدم فراہمی۔ اردو تعلیم اور تعلم کو رواج دینے میں مختلف سطحوں پر سرکاری عملے کی طرف سے روکاوٹیں۔ یا اردو اسکولوں میں انفرا اسٹرکچر (Infra Structure) کا فقدان وغیرہ۔ یہ مسائل دیگر اسکولوں اور آبادیوں کے بھی ہیں۔ لہٰذا کرنا صرف یہ ہے کہ ایک بیدار رائے عامہ تیار کر کے ان کمیوں کی طرف انتظامیہ اور سرکار کا دھیان کھینچنا ہے اور مستقل تحریک چلا کر ڈنڈی ماری کے عمل کو روکنا ہے اور اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سہولیات حاصل کرنا ہے۔ اگرچہ نصابِ تعلیم کو فرقہ واریت سے پر کرنے کی زوردار مہم چل رہی ہے اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور زبان پر ہر طرف سے حملے کئے جا رہے ہیں تاہم ان بنیادوں پر ہم سرکاری سہولیات سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ملت کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ اتنے وسیع و عریض علاقے میں پھیلی مسلمان آبادی اور اس کے ہر طبقہ کی تعلیمی ضروریات اپنے وسائل اور کوشش سے پوری کر سکے۔ پرائمری ایجوکیشن میں اگر ہم کوئی انتظام کر لیں تو یہ ممکن ہے، لیکن فنی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں ہم حکومت کی مدد کے بغیر یا حکومتی اداروں سے فائدہ اٹھائے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں۔ اس لئے ہمیں بڑھ چڑھ کر اس معاملے میں اپنا حصہ وصول کرنا چاہیے۔

مسلمان چونکہ تعلیمی اعتبار سے ایک پس ماندہ ملت ہیں اس لئے دیگر پس ماندہ اقوام کی طرح فنی اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں ان کو کم سے کم دس فی صد ریزرویشن ملنا چاہیئے تاکہ ان کے بچے بھی ان سہولیات سے فائدہ اٹھا سکیں اور آگے بڑھ سکیں۔ یہ ایک جائز مطالبہ ہے جس کو کسی بھی دلیل کی بنیاد پر رد نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ سرکاری سہولیات سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں چار تجاویز اور ہیں جن پر ملت کو غور کرنا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں اگر ان تجاویز کو ٹھنڈے پیٹوں قبول کیا گیا اور اِن پر غور و عمل ہوا تو دس سال کے اندر اندر ملت میں زبردست تعلیمی بیداری پیدا ہوگی اور ترقی کے وسیع امکانات پیدا ہوں گے۔

❶ ہر کھاتا پیتا خاندان جس کی ماہانہ آمدنی 10 تا 15 ہزار یا اس سے اوپر ہے کم از کم ایک بچے

کو تعلیمی گود لے اور اس کے پورے تعلیمی اخراجات کی کفالت کرے۔ یعنی ایک اوسط درجہ کے پبلک اسکول میں جو خرچ آتا ہے اس کو برداشت کرے۔ یہ سلسلہ کم از کم میٹرک تک جاری رہنا چاہئے۔ مدرسوں کے طلبا کو بھی اس ضمن میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اسے میں تعلیمی گود اسکیم کہتا ہوں۔ ملت سے گذارش ہے کہ اس تجویز پر انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر غور کیا جائے اور اس سلسلے میں ایک ورکنگ فارمولہ وضع کیا جائے۔

❷ کم از کم ہر ضلع میں کوئی ایک اسکول یا ادارہ ہو جس کو ملت ایڈوپٹ کر لے۔ یعنی اس ادارے کے تمام انتظامی اخراجات ملت پورا کرے اور وہاں بالخصوص غریب بچوں کی معیاری تعلیم کا نظم کیا جائے۔

❸ ہر سال پرائمری، سکنڈری، انٹرمیڈیٹ لیول پر ملت میں Talent Search Examination لئے جائیں۔ اور ایسے بچے جن کے اندر Talent ہے مگر محض اپنی غربت، مالی پریشانی یا صحیح گائڈینس نہیں ہونے کی وجہ سے ان کی صلاحیتیں صحیح سمت میں پروان نہیں چڑھتی ہیں، ایسے بچوں کی مناسب رہنمائی کی جائے اور ان کی مالی معاونت بھی کی جائے۔ ہر سال کم از کم ایک لاکھ بچوں کو مختلف سطحوں پر منتخب کر کے ان کو بھرپور مالی مدد دی جائے تاکہ وہ اطمینان سے اپنی پوشیدہ، خوابیدہ صلاحیتوں کو فروغ دے سکیں اور ملت کے لئے سرمایہ بن سکیں۔ اس پروگرام کا ایک پورا خاکہ مرتب کر کے ملت کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے اور مختلف ذرائع سے اس کو بروئے کار لانے کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ عام انفاق کے علاوہ زکوٰۃ کی رقم سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں ایک ملی تعلیمی فنڈ بنانا چاہیئے۔ ابتدائی طور پر اگر ہم ان کاموں کے لئے تیار ہو جائیں تو نہ صرف یہ کہ ملت کے تعلیمی میدان میں ایک انقلاب پیدا ہو جائے گا بلکہ اس سے معاشی بہتری کی ہزار راہیں خود بخود نکل آئیں گی۔ اس سلسلے میں ایک تفصیلی خاکہ مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

❹ اس سلسلے کی آخری تجویز یہ ہے کہ ایک جنوری 1990ء کو جو بچہ پیدا ہوا ہے اس کو ایک حد مان کر اس کے بعد جتنے بچے پیدا ہوئے ہیں ان کو ایک ٹارجٹ گروپ بنا کر ان میں سو فی صد

تعلیم کے حصول کا منصوبہ بنانا چاہئے۔ یہ کام بہت مشکل نہیں ہے۔ اس کو کسی ایک ریاست سے شروع کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بہار میں جماعت اسلامی، امارت شرعیہ، ادارہ شرعیہ، اہل حدیث اور دیگر تنظیموں اور اداروں وغیرہ کو جن کی شاخیں بہار کے قریب قریب ہر ضلع، سب ڈویژن، قصبہ، پنچایت اور گاؤں میں پھیلی ہوئی ہیں، اپنی تنظیمی اکائی کے ذریعہ ان بچوں کا سروے کرائیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ اس عمر کے کس خاندان اور آبادی میں کتنے بچے ہیں۔ ان بچوں کے والدین کی مالی حالت کیا ہے اور وہ بچوں کی تعلیم کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ ایسے بچے جن کے والدین بے شعور اور غریب ہیں اور جہاں اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر ان کی مناسب رہنمائی نہیں کی گئی یا ضروری سہولیات پہنچائی نہیں گئیں تو وہ ان پڑھ رہ جائیں گے یا جلد ہی اسکول چھوڑ دیں گے ان کے مخصوص حالات کا جائزہ لے کر ان پر مشتمل ایک منصوبہ بندی سے عوام کے سامنے آنا چاہئے۔ محض تعلیمی بیداری مہم یا کاروان نکالنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ بلکہ زمینی سطح پر ٹھوس منصوبہ بندی کے ساتھ واضح حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ابھی حال ہی میں امارت شرعیہ نے بھی ایک تعلیمی مہم شروع کی ہے۔ ریاست میں چند اور رضا کار تنظیمیں ہیں جنہوں نے اس میدان میں کچھ کام کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ کام ایسے تمام افراد اور تنظیموں کو جوڑ کر بھی کیا جا سکتا ہے اور الگ الگ بھی۔ بہر حال ایک مثبت پیش رفت کی ضرورت ہے۔ اگر مندرجہ بالا ان چاروں تجاویز پر غور کر کے ہم کوئی عملی منصوبہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تو یہ ملت کی تعلیمی بہتری اور معاشی بہتری دونوں کے لئے فال نیک ثابت ہوگا۔

۴ معیشت کے تمام شعبوں بالخصوص سروس سیکٹر میں پیش رفت کی ضرورت

عموماً ملکی معیشت کو تین شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ زراعت، صنعت و حرفت اور خدمات جس کو Service Sector بھی کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے جس کی 68% آبادی کھیتی اور متعلق کاموں سے جڑی ہے۔ حالانکہ ہندوستان کی زراعت ابھی بھی

روایتی ڈھنگ سے ہوتی ہے اور پچھڑی ہوئی حالت میں ہے۔ پیداوار کم ہوتی ہے۔ پیداوار کی قیمت بھی کسانوں کو مناسب طور پر نہیں مل پاتی۔ چھوٹے اور مجھولے کسان جن کی تعداد زیادہ ہے اس سے بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ کھیتی مانسون پر منحصر ہے جہاں کبھی باڑھ اور کبھی سکھاڑ کی کیفیت رہتی ہے۔ کھیتی کے میدان میں سبز انقلاب آنے کے باوجود کئی ایسے مسائل ہیں جو لاینحل ہیں جس کی وجہ سے کسانوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالیہ دنوں میں نئی معاشی پالیسی کے تحت کھیتی کی صورتحال اور بھی خراب ہوئی ہے GATT Agreements اور WTO کے نئے نظام میں ہندوستانی زراعت تباہی کے دہانے پر پہنچ گئی ہے۔ گاؤں میں کسانوں میں چھپی ہوئی بے روزگاری عام ہے اور روزگار کے دیگر مواقع نہ ہونے کی وجہ سے ان کی غربت اور محرومی بڑھتی جا رہی ہے۔ شہروں کی طرف گاؤں کی بڑی آبادی کی منتقلی جس نے شہروں میں گندگی، بیماری، جرائم اور کئی دوسرے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، اسی کی دین ہے۔ کسان جو سخت حالات میں بھی جینے کا دم خم رکھتے تھے اب ان کے اندر خودکشی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ہریانہ، دہلی، پنجاب، مہاراشٹر، آندھرا پردیش، اتر پردیش، گجرات اور راجستھان کے کسان بڑی تعداد میں خودکشی کر رہے ہیں۔ معیشت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ملکی معیشت میں زراعتی شعبہ کی حصہ داری گھٹتی جا رہی ہے۔ مثلاً 1950-51 میں کل قومی آمدنی میں زراعتی شعبہ کا حصہ 55.4% تھا جو 1990-91 میں گھٹ کر صرف 30.9% ہو گیا اور 1999-2000 میں محض 25.5% رہ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل قومی آمدنی کے اعتبار سے زراعتی شعبہ کی حصہ داری گھٹ رہی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ صنعتی شعبہ اور دیگر شعبوں کی حصہ داری بڑھ رہی ہے۔

ملکی ترقی کے لوازم میں ایک بات یہ تسلیم کی گئی ہے کہ جب کوئی معیشت ترقی کرتی ہے تو زراعت سے صنعت کی طرف بڑھتی ہے۔ ہندوستان میں صنعتی ترقی تو ہوئی ہے لیکن ہندوستان صنعتی ملک نہیں کہا جا سکتا۔ ہندوستان میں مشترکہ معیشت یعنی Mixed Economy ہے جہاں ایک طرف سرکاری شعبہ کی صنعتیں ہیں تو دوسری طرف نجی شعبہ کی صنعتیں ہیں اور کچھ صنعتیں نجی اور سرکاری شعبہ کے اشتراک سے چلتی ہیں جن کو Joint Sector کہتے ہیں۔ ہندوستان میں

سرکاری شعبہ کی صنعتوں کو Commanding Heights عطا کیا گیا تھا تاکہ ملک کی معیشت تیزی سے ترقی کرے۔ مگر یہ تجربہ ناکام رہا اور قریب قریب سبھی سرکاری صنعتیں یا تو بیمار ہیں یا بند پڑی ہیں یا گھاٹے میں چل رہی ہیں۔ صرف دو چار ہی صنعتیں ایسی ہیں جو نفع میں چل رہی ہیں۔ ملکی معیشت اور عالمی دباؤ کے نتیجے میں نئی معاشی پالیسی کے تحت اب سرکار نے ان صنعتوں کے Disinvestment کا پروگرام بنایا ہے۔ نجی شعبوں میں ملکی اور بین الاقوامی دونوں سرمایہ کو لانے اور بڑھاوا دینے کی زبردست اسکیم بنائی گئی ہے تاہم ابھی تک اس میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی ہے اور ملک کی صنعتی ترقی خاطر خواہ نہیں ہوسکی ہے۔ بلکہ یہ ہندوستانی معیشت کا عجب ہے کہ بغیر صنعتی ملک بنے یہ ملک معیشت کے تیسرے مرحلہ میں داخل ہوگیا ہے۔ 1950-51 میں ملکی آمدنی میں صنعتی شعبہ کی حصہ داری 12.8% تھی جو 1990-91 میں 25.4% ہوگئی اور 1999-2000 میں یہ حصہ داری گھٹ کر 22.1% رہ گئی ہے۔ اب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تک ملک کی صنعتی ترقی نہیں ہوگی ملک کی معاشی ترقی ٹھوس بنیادوں پر کیسے ہوسکتی ہے؟

اس پوری بحث سے میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ دراصل اس وقت Service Sector جو ہے وہ بڑھ رہا ہے اور یہ روزگار اور ملکی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے۔ Service Sector سے فائدہ اٹھانے کے لئے تھوڑے علم اور تھوڑے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ لہٰذا یہ وہ میدان ہے جس میں مسلمان چاہیں تو منصوبہ بند ڈھنگ سے قسمت آزمائی کرسکتے ہیں اور اپنی معاشی حالت کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ بھارت میں Service Sector کی بڑھتی ہوئی حصہ داری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1950-51 میں ملکی آمدنی میں اس شعبے کی حصہ داری محض 31.8% تھی جو 1990-91 میں بڑھ کر 43.7% اور 1999-2000 میں 52.4% ہوگئی۔ اور اس میں بے پناہ ترقی کے امکانات ہیں۔ میں یہاں صرف چند شعبوں میں اس کے بڑھتے امکانات کا جائزہ پیش کروں گا۔
I T Sector میں اس وقت چھ بلین ڈالر کی آمدنی ہورہی ہے جو ہندوستانی روپے میں 27,600 کروڑ بنتا ہے۔ اس شعبہ میں سن 2008 تک 87 بلین ڈالر کی آمدنی متوقع ہے جس میں 70 لاکھ لوگوں کو روزگار مل سکے گا۔ ٹیلی کمیونیکیشن میں 20-25 بلین ڈالر کی آمدنی اگلے پانچ سال میں

متوقع ہے۔ ملک میں اس وقت 50 بلین ڈالر کا سامان فروخت ہوتا ہے۔ خوردہ کاروبار کی حصہ داری کل معیشت کا 11% ہے جس میں 20 ملین لوگ لگے ہوئے ہیں جو ملک کی کل Workforce کا 6% ہے۔ اس میں لامتناہی بڑھوتری کا امکان ہے۔ لہٰذا اس شعبہ سے بیش از بیش فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

۵۔ نئی معاشی پالیسی مسائل اور امکانات

1991ء سے ہندوستان میں نئی معاشی پالیسی جس کو عرف عام میں گلوبلائزیشن اور لبرلائزیشن کا نام دیا جاتا ہے نافذ ہے۔ اس نئی معاشی پالیسی نے جہاں بہت سارے چیلنجز ہمارے سامنے لا کھڑے کئے ہیں وہیں اس نے بہت سے مواقع بھی پیدا کئے ہیں۔ مسلمانوں کو نہ صرف سرکاری شعبوں سے بلکہ پرائیویٹ کارپوریٹ سیکٹر سے بھی یہ شکایت رہی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو اپنے یہاں رکھنے میں روایتی بخل کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کارپوریٹ سیکٹر میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی بہت کم ہے۔

ہندوستان میں گلوبلائزیشن کے حسن وقبح پر بحث جاری ہے اور لوگ مختلف زاویہ سے اس کی اچھائی اور برائی کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ماہرین معاشیات اور سماجی رہنما اس معاملہ میں دو خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کچھ کی رائے میں یہ پالیسی ملکی معیشت اور تہذیب وثقافت کے لئے نقصان دہ ہے تو کچھ کی رائے میں یہ وقت کی ایسی ضرورت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام تر اختلافات کے باوجود بڑی حد تک ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں میں اس مسئلہ پر اتفاق رائے پائی جاتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر پہلے مرحلے کے بعد اب دوسرے مرحلے کی اصلاحات (Second Generation Reforms) کے نفاذ کا عمل شروع ہوگیا ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب عالمیت اور کھلا پن کی معیشت کا اصول اس وقت تک قائم رہے گا جب تک اس کے متبادل کے طور پر پھر کوئی عالمی نظام ابھر کر سامنے نہیں آتا۔ اس صورت میں کم از کم یہ اصولِ معیشت اگلے بیس پچیس سالوں تک قائم اور باقی رہے گی۔ اس کے بعد ہی اس میں کسی

بدلاؤ کا امکان ہے۔ 20-25 سال کی مدت کا مطلب ہے ایک پوری نسل کا عرصۂ حیات۔ مسلمانوں نے ماضی میں بعض اصولی باتوں کو اتنی سختی سے پکڑا کہ وہ اس کے عملی پہلو پر دھیان بھی نہیں دے سکے۔

جس وقت انگریز اس ملک میں آئے انہوں نے اپنی سیاسی اور معاشی مصلحت کے تحت اس ملک کی صنعتی اور تعلیمی پالیسی کو یکسر بدل دیا۔ چونکہ انگریزوں نے مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا اس لئے ان کے دلوں میں انگریزوں سے شدید نفرت تھی۔ وہ انگریزوں کو اس ملک سے بھگانے میں کامیاب تو نہیں ہوئے۔ لیکن اپنی دشمنی کو اس درجہ باقی رکھا کہ اپنے تمام تر سماجی اور معاشی مفادات پر از خود تالا لگا دیا۔ جبکہ دوسرے لوگ جو بعد میں یگ پروش اور آزادی کے بڑے سورما مانے گئے انہوں نے آگے بڑھ کر نئے اقتدار سے وفاداری دکھائی اور دونوں ہاتھوں سے ان مواقع سے فائدہ اٹھایا نتیجہ کے طور پر قومی مسابقت کے دور میں وہ مسلمانوں سے سینکڑوں میل آگے نکل گئے اور مسلمان محوِ جرسِ کارواں رہ گئے۔ اور آج صورتحال یہ ہے کہ جب معیشت ان کے ہاتھ سے نکل گئی تو سیاست کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اب وہ سیاست اور معیشت دونوں اعتبار سے حاشیہ پر کھڑے ہیں جہاں اپنی بے وقعتی پر آٹھ آٹھ آنسو بہانے کے سوا ان کے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

بجا طور پر مسلمانوں کو بھی گلوبلائزیشن اور لبرلائزیشن کی پالیسی سے بعض اصولی اختلاف ہے۔ نظری طور پر اس کے نقصاندہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہری بات ہے جو پالیسی مغربی نو استعمار (Neo-Imperialist) نے اپنے فائدہ کے لئے وضع کی ہے اس میں پس ماندہ اقوام اور ممالک کو بہت زیادہ فائدے کا امکان نہیں ہے۔ سوال قوتِ نافذہ کا ہے۔

کیا ہم نئی معاشی پالیسی اور اس کے مضمرات سے بچ سکتے ہیں؟ اور اس کا متبادل کیا ہے؟ یہ دونوں سوالات محتاج جوابات ہیں۔ تو جب ہم اس سے بچ نہیں سکتے اور ہمارے پاس اس کا کوئی متبادل نہیں ہے تب ہمارے پاس ایک تیسرا راستہ رہ جاتا ہے کہ ہم اس کے غلط اثرات سے کس حد تک خود کو بچا سکتے ہیں اور دوسرے اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟

لہٰذا ہمارے دانش وروں کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہئے اور گلوبلائزیشن نے جو چیلنجز ہمارے سامنے لا کھڑے کئے ہیں اس کو کس طرح مواقع میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس پر غور کرنا چاہئے۔
اس سلسلے میں اوپر کی سطور میں بعض امور کی نشاندہی کی گئی ہے جن پر سنجیدگی اور گہرائی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

۶۔ روایتی صنعتوں کی تنظیم نو کی ضرورت

مسلمان بنیادی طور پر تاجر، صناع، کاریگر اور دست کار رہے ہیں جنہیں حالات اور امتداد زمانہ نے دہاڑی پر کام کرنے والا مزدور ... ہے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں سے یا تو وہ ساری صنعتیں نکل گئی ہیں جو پہلے ان کی پہچان تھیں یا پھر وہ دم توڑ رہی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کے اندر جدید جانکاری کی کمی ہے۔ اپنے آپ کو وقت اور بازار کی ضرورتوں کے مطابق بدلنے کی عدم صلاحیت، سرمایہ، کچے مال وغیرہ کی کمی، حکومت کی عدم توجہی، مسابقت کا بڑھتا رجحان اور بازار میں متبادل مصنوعات کی آمد وغیرہ ہیں۔ ابھی تک ان صنعتوں کو مقامی صنعت کاروں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور جن سے مسابقت کرنے میں یہ خود کو کمزور محسوس کرتے تھے۔ اب جبکہ نئی معاشی پالیسی کے تحت ملک کی معیشت کے دروازے پوری طرح بیرونی سرمایہ اور سامانوں کے لئے کھول دیئے گئے ہیں اور Quantitative Restrictions کو ختم کر دیا گیا ہے، ان صنعتوں کے لئے اور بھی مشکل حالات پیش آ سکتے ہیں۔ لہٰذا نئی صورتحال کے پیش نظر ان کی تنظیم نو یعنی Structural Re-adjustment کی زبردست ضرورت ہے۔ یہ کام علمی بھی ہے اور عملی بھی ہے۔ اس کے لئے الگ الگ صنعتوں پر مشتمل Workshop Seminar کی ضرورت ہوگی اور ان کی الگ الگ Case Study کر کے ان کے مسائل کا پوری تفصیل اور باریک بینی سے جائزہ لینا ہوگا تاکہ نئے حالات میں ان کی واضح رہنمائی کی جا سکے۔ اس کے لئے مسلم ماہرین معاشیات، تجارتی شعبہ کے ماہرین، مسلمان صنعت کار اور سرکار کے صنعتی شعبوں کے ذمہ داران نیز بنکروں کی میٹنگ بلانے کی ضرورت ہے۔ یہ کام مسلمان سیاست دانوں کو جو اسمبلی اور

پارلیامنٹ کے ممبر ہیں پہلی فرصت میں کرنا چاہئے۔ ورنہ اگر یہ رہی سہی صنعت بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہماری عدم توجہی کی وجہ سے نکل گئی تو بڑا ملی نقصان ہوگا جس کی کسی طرح بھرپائی ممکن نہیں ہوگی۔

ان صنعتوں میں بھیونڈی، جلگاؤں، مدراس، مئو، بنارس، ٹانڈہ، جلال پور، خلیل آباد، بہار شریف، مدھوبنی اور بھاگلپور میں کپڑے، سلک بنارسی ساڑیاں اور کھادی کے کپڑے جن کو ہتھ کرگھا کہتے ہیں کی صنعت قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح چمڑے اور جوتا سازی کی صنعت ہے۔ علی گڑھ کے تالوں کی صنعت ہے۔ مرزاپور اور بھدوئی میں قالین بافی کی صنعت ہے۔ فیروزآباد میں چوڑی کی صنعت ہے۔ نگینہ اور میرٹھ میں لکڑی کی بنی مصنوعات کی صنعت ہے۔ مرادآبادی برتنوں اور کشمیر کے گرم کپڑوں کی صنعت ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی صنعتیں ملت کی جان ہیں جن سے غیر منظیم طور پر ہی سہی ملت کے تمام فلاحی اور دینی کام انجام پاتے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں مدارس اسلامیہ میں پڑھنے والے لاکھوں بچوں کی کفالت انہی صنعتوں کے ذریعہ یا پھر بڑے شہروں میں کام کرنے والے کچھ اچھے تجار کے ذریعہ ہوتی ہے۔ لہٰذا ان صنعتوں کی حفاظت اور فروغ، ملی استحکام اور فروغ کا حصہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملی فلاح، تعمیر کا کام کرنے والی ایک ایسی ایجنسی بنائی جائے جو ان صنعتوں کے حالات و مسائل کا گہرائی سے جائزہ لے اور ان کو منظّم اور مستحکم کرنے کی تدابیر سامنے لائے۔ اس کے لئے ان اداروں کو ملت اور حکومت دونوں کی پشت پناہی چاہئے اور ان کی ترقی کے لئے سازگار ماحول کے علاوہ ان کو پالیسی سپورٹ دی جانی چاہئے۔ اس کام کو اقتصادی ماہرین کے ایک گروپ کے حوالے کیا جا سکتا ہے جن کی فنڈنگ یا تو یہ ادارے مل جل کر کریں یا پھر کسی مسلمان ایجنسی کے ذریعہ یہ کام کیا جائے یا حکومت اور اس کے اداروں کی توجہ مبذول کرا کر اس کام کو انجام دیا جائے۔ یہ کام جلد اور بلا تاخیر شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

۷۔ رفاہی اور ترقیاتی اسکیموں سے فائدہ

حکومت نے محروم طبقات اور افراد بالخصوص ایسے لوگ جو غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گذار

رہے ہیں ان کی غریبی دور کرنے کی غرض سے یعنی غریبی پر براہ راست حملہ کر کے اس کو ختم کرنے کے لئے چند اسکیمیں وضع کی ہیں جن پر سالانہ اربوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔ یہ اسکیم بالخصوص دیہی علاقوں میں یا شہر کے ان حصوں میں چلائی جاتی ہیں جہاں غریب آبادیاں ہیں۔ ان میں تین طرح کی اسکیمیں ہیں۔

❶ خودروزگار اسکیم جس کو Self Employment Scheme کہتے ہیں جیسے IRDP وغیرہ

❷ مزدوری پرمبنی روزگار اسکیم جس کو Wage Employment Scheme کہتے ہیں۔ اس میں جواہر روزگار یوجنا، روزگار کی امدادی اسکیم وغیرہ شامل ہیں۔

❸ تیسری اسکیم وہ ہے جس کو سماجی تحفظ اسکیم یا سماجی امدادی اسکیم Social Assistance Programme کہتے ہیں جن میں تین طرح کی اسکمیں ہیں۔

1. Old Age benefit Scheme 2. Maternity benefit scheme اور

3. Accident Assistance Scheme

ان اسکیموں کے نفاذ اور ملنے والے فائدوں کے بارے میں طرح طرح کی شکایتیں ہیں مثلاً ان اسکیموں سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا جن کے لئے یہ اسکیمیں وضع کی گئی ہیں۔ زیادہ تر فائدہ وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو سیاسی دلال ہوتے ہیں یا پھر سرکاری عملہ ہوتا ہے۔ ان اسکیموں کا زیادہ تر فائدہ سماج کا وہ طبقہ اٹھاتا ہے جو غریبی کی سطح سے اوپر ہے یا جن کو ان چیزوں کی جانکاری ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گذارتے ہیں، اپنی غربت، سماجی بے وقعتی اور عدم واقفیت کی وجہ سے ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتے ہیں۔ مسلمانوں میں کتنے لوگ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گذار رہے ہیں اس کا کوئی باوثوق ڈاٹا ہمارے پاس موجود نہیں ہے تاہم ایک رف اندازے کے مطابق مسلمانوں کی 55-50 فیصد آبادی غریبی کی سطح سے نیچے ہے۔ جب عام طبقات کو جہاں ایک گونہ مضبوط سیاسی لیڈرشپ فراہم ہے اور کچھ افراد رضاکار کے طور پر بھی کام کر رہے ہیں ان اسکیموں سے پورا فائدہ نہیں مل رہا ہے۔ تو ظاہری بات ہے کہ مسلمانوں

کو اس سے کیا اور کتنا فائدہ ملتا ہوگا؟

دراصل ہمارے یہاں قدم قدم پر ایسے تحقیقاتی اور تجزیاتی ادارے کی ضرورت ہے جو اس گیپ کو پورا کرے۔ مسلمانوں کی سماجی اور دینی تنظیموں کو چاہئے کہ وہ اپنے بجٹ کا ایک حصہ تحقیقی اور تجزیاتی کاموں کے لئے وقف کریں اور ان اسکیموں کی اسٹڈی کرائیں جن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ مسلمانوں پر اثر پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ ان اسکیموں سے مسلمانوں کے ٹارجٹ گروپ کو کیا اور کتنا فائدہ مل رہا ہے؟ اگر نہیں مل رہا ہے تو کیوں؟ اور کس طرح ان کو ان سے فائدہ دلوایا جا سکتا ہے؟ ابھی حال ہی میں حکومت بہار نے اندرا آواس یوجنا کے تحت اس گروپ سے تعلق رکھنے والے دس فیصد مسلمانوں کو بھی اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے کی بات منظور کی ہے۔ حکومت کی سطح پر اور پالیسی کی حد تک تو بہت ساری چیزیں ہو جاتی ہیں لیکن عملاً ان کا نفاذ نہیں ہو پاتا۔ اس لئے ایسے افراد اور گروپ کی ضرورت ہے جو حکومت کی ان اسکیموں، ایجنسیوں اور مسلمانوں کے درمیان رابطے کا کام کریں۔ ان کو صحیح اور پوری جانکاری بہم پہنچائیں اور ان کو ان اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کے لئے اپنی خدمات پیش کریں اور جو لوگ ان اسکیموں کے نفاذ میں ڈنڈی ماری کرتے ہیں ان کو بے نقاب کریں۔ اقلیتی کمیشن اور مسلمان صحافیوں وغیرہ کو ان اسکیموں کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے۔ میں یہ بات مانتا ہوں کہ سرکاری نوکریوں میں تحفظ (Reservation) کی بات اتنی کارگر ثابت نہیں ہوگی کیونکہ سرکاری نوکریوں کا حجم سکڑتا جا رہا ہے۔ اس لئے رفاہی اور ترقیاتی اسکیموں میں مسلمانوں کو دس فیصد ریزرویشن ملنا چاہئے تا کہ ان اسکیموں کا پورا فائدہ اس محروم کمیونٹی کو مل سکے۔

۸۔ وزارت اقلیتی فلاح اور اقلیتی کمیشن کو فعال اور مؤثر بنانے کی ضرورت

ملک میں پرومسلم اور اینٹی مسلم دونوں طرح کے رجحانات بڑی تیزی سے پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ دراصل کمیونٹی لیڈرشپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ کس طرح اینٹی مسلم رجحانات کو کنٹرول اور کنٹین (Control & Contain) کرتی ہیں اور پرومسلم رجحانات سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ مسلمانوں کے

زبردست سیاسی دباؤ کے تحت ملک میں اقلیتی کمیشن قائم ہے اور مختلف ریاستوں میں بھی ریاستی اقلیتی کمیشن قائم کئے گئے ہیں۔ جنہیں Executive & Constitutional Powers بھی دی گئی ہیں۔ اسی طرح کئی ریاستوں میں وزارت اقلیتی فلاح قائم کی گئی ہے، جس میں Cabinet Level کا ایک وزیر مقرر ہے۔ بہار ان دونوں معاملوں میں پورے ہندوستان میں تاریخ ساز اہمیت رکھتا ہے۔ میری رائے میں اقلیتی فلاح کے لئے مندرجہ ذیل امور پر تیزی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

1. بہار کی سطح پر مسلمانوں کا Economic Survey کرایا جائے اور اسی طرح ہر ریاست میں یہ سروے ہونا چاہئے۔
2. بہار کی تمام تر ترقیاتی اور فلاحی اسکیموں میں مسلمانوں کو دس فیصد فائدہ دلانے کا یقینی ضابطہ بنایا جائے۔ ریاست کی زراعتی، صنعتی، تعلیمی اور سماجی فلاحی اسکیموں میں مسلمانوں کو بھرپور فائدہ دلانے کی کوشش کی جائے اور اپنے اداروں کے ذریعہ ان اسکیموں کی معلومات عام مسلمانوں تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ یہ عمل دیگر ریاستوں میں بھی ہونا چاہئے۔
3. اقلیتی فلاحی منصوبوں کو کارگر ڈھنگ سے لاگو کرنے کے لئے اور نئے نئے منصوبوں کو وضع کرنے کی غرض سے سرکاری عملہ کے علاوہ مسلمانوں کی جو دینی، سماجی، تنظیمیں ہیں مثلاً جماعت اسلامی، امارت شرعیہ، ادارہ شرعیہ، جمعیت اہل حدیث، اہل تشیع کی تنظیم اور دیگر تنظیمیں مثلاً پس ماندہ مسلم محاذ اور مورچہ وغیرہ ان کے ذمہ داروں نیز ریاست کے مسلم دانشوروں، صحافیوں اور سماجی کارکنوں پر مشتمل ایک اعلیٰ مشاورتی کمیٹی تشکیل دی جائے تا کہ ان کے تعاون سے مسلمان اور دیگر اقلیتیں اقلیتی کمیشن اور وزارت اقلیتی فلاح سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

اگر ان تجاویز پر باقاعدگی سے عمل ہو تو یہ کام نہ صرف ریاست بہار میں بلکہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی فلاح اور تقویت کے باب میں فال نیک ثابت ہوگا۔

۹۔اقلیتی مالیاتی کارپوریشن کو مستحکم کرنے کی ضرورت

مرکزی سطح اور بہار میں بھی اقلیتی مالیاتی کارپوریشن قائم ہے۔لیکن جیسا کہ اس ادارے کی کارکردگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے مناسب مقدار میں بجٹری سپورٹ نہیں مل رہا ہے جس کی وجہ سے یہ ادارہ اقلیتوں کو خود روزگار یا دیگر اسکیموں کے تحت مناسب مقدار میں مالی تعاون نہیں فراہم کر پا رہا ہے۔ حال فی الحال حکومت بہار نے کچھ لوگوں کو بہت محدود پیمانے پر کچھ سہولتیں بہم پہنچائی ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ادارے کو مناسب مقدار میں رقوم فراہم کی جائیں تاکہ یہ ادارہ مؤثر ڈھنگ سے اقلیتوں کو مالی امداد فراہم کر سکے۔اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ صرف سامان یا امداد دینے پر ہی اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان ذرائع سے جو بھی رقم یا سامان دیا جاتا ہے اس سے لوگ صحیح طور پر کاروبار کر رہے ہیں یا نہیں اور رقوم کی واپسی ٹھیک ڈھنگ سے ہو رہی یا نہیں اس کی نگرانی (Monitoring) باقاعدہ ہونی چاہئے اور جو لوگ Defaulter پائے جائیں ان کا سامان ضبط کیا جانا چاہئے نیز ان پر ضابطے کے مطابق مؤثر کاروائی کی جانی چاہئے تاکہ یہ اسکیم فلاپ نہ ہو اور سرمایہ کا Rotation نہ رکے۔اس لئے کہ ایسی کسی اسکیم کی ناکامی مستقبل کے امکانات کو مخدوش کر دیگی جو کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

۱۰۔شرح سود میں کمی اور بلاسودی قرضے کا اہتمام

ساری دنیا میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ سرمایہ کی لاگت (Cost of Capital) جس کو عرف عام میں سود کہتے ہیں، کی وجہ سے اس وقت ساری دنیا میں مندی کی صورتحال پیدا ہوگئی ہے۔لہٰذا مناسب سرمایہ کاری (Investment) کا ماحول پیدا کرنے کے لئے، اور امور کے علاوہ سود کی شرح کو کم کرنے کی تجویز ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں بالعموم اور ہندوستان میں بالخصوص Fiscal Deficit کا معاملہ بہت پیچیدہ شکل اختیار کر گیا ہے۔لہٰذا اس Fiscal Deficit کو کم کرنے کی مختلف تجاویز میں ایک تجویز سرکاری قرضوں پر شرح سود کو کم کرنا ہے۔ چنانچہ اس بار کے بجٹ (2001-2002) میں Small Sector Savings جس میں Provident Fund اور

Pension Scheme یا اس قسم کی جو جمع اسکیم ہیں ان پر شرح سود کم کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں لگ بھگ 48% قومی آمدنی سود کی ادائیگی پر خرچ ہوتی ہے۔جس کے باعث ترقیاتی کاموں کے لئے سرمایہ کی فراہمی ممکن نہیں ہو پاتی اور حکومت روز بروز قرض کے جال میں پھنستی جا رہی ہے۔ یہی کچھ کیفیت صنعتوں کی ہے اس میں چھوٹی صنعتیں زیادہ متاثر ہوتی ہیں کیونکہ ان کے پاس بازار کی Vagaries کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔اس صورت میں اگر ان کی پیداواری لاگت زیادہ ہوئی تو مسابقت کے اس دور میں بازار میں ان کا ٹکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے ساری دنیا میں یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ سود کی شرح کم کی جائے۔جاپان میں Zero Rate of Interest پر Lending ہوتی ہے۔دنیا کے دوسرے ملکوں میں سود کی شرح 5-6% سے زیادہ نہیں ہے۔ابھی بھی ہندوستان میں سود کی شرح دنیا میں سب سے زیادہ ہے، جو ملک کی معاشی ترقی کی راہ میں ایک بڑی روکاوٹ ہے۔اس لئے ماہرین کی رائے یہ ہے کہ اس میں مناسب انداز اور مقدار میں کمی کی جانی چاہئے۔اس سلسلے میں کیا نظریاتی صورتحال ہے اس کے جائزہ کا یہاں موقع نہیں ہے۔ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بازار کے تقاضوں کے مطابق شرح سود کو Rationalise کرنے کی اشد ضرورت ہے۔مسلمانوں میں آج بھی بہت سے لوگ ایسے ہیں جو سود کی وجہ سے حکومت اور بینک کے بہت سارے ترقیاتی منصوبوں سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ ایک جمہوری ملک میں ان طبقات کے عقائد کا احترام کرتے ہوئے ان کے لئے کچھ خصوصی اسکیم وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ حکومت بسا اوقات کچھ خاص میدانوں اور علاقوں میں Investment کو بڑھانے کے لئے سبسیڈی اور ٹیکس ہالی ڈے اسکیم چلاتی ہے۔ Subsidy کی غیر معقولیت بڑی حد تک ثابت ہو چکی ہے۔اس لئے اس کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ایک تو ہندوستان میں سود کی شرح زیادہ ہے دوسرے یہ جو کمپاؤنڈ انٹریسٹ کا نظام قائم ہے اس نے چھوٹی صنعتوں، کسانوں اور دیگر لوگوں کے لئے جینا حرام کر دیا ہے۔میرے خیال سے حکومت کو اس کا متبادل سوچنا چاہئے اور اس سلسلے میں ہماری طرف سے پانچ تجاویز دی جا رہی ہیں جن پر غور کیا جانا چاہئے۔

1. شرح سود کم کی جائے اور Compound Interest کو یکسر ختم کر دیا جائے۔ آج ملک کی مختلف ریاستوں میں کسان جس تیزی سے خودکشی کر رہے ہیں اگر سود کی استحصالی میکنزم ختم کر دی جائے تو کسان اس سے بچ جائیں گے اور دوسرے چھوٹے کام گاروں کو بھی راحت ملے گی۔
2. ایک لاکھ تک جو سرمایہ کسی کو خود روزگار اسکیم یا زراعتی ترقی کے لئے دیا جائے اسے بالکلیہ سود سے پاک رکھا جائے۔
3. سبسیڈی یکسر ختم کی جائے اور اس کی جگہ پر بلاسودی قرضوں کا انتظام کیا جائے۔
4. Tax System کو Rationalise کیا جائے لیکن Tax Holiday کو ختم کیا جائے۔
5. کسانوں کو قرض معافی جیسی Populist Scheme کی جگہ اگر بلاسودی قرضوں کو رواج دیا جائے تو اس سے Public Excnequer اور کسان دونوں پر کم بوجھ پڑے گا اور لوگوں کو راحت ملے گی۔

سوال یہ ہے کہ اس صورت میں سرمایہ کہاں سے آئے گا اور کن لوگوں کو بلاسود قرض ملے گا۔ اس صورت میں اگر لوگ قرض کی ادائیگی نہیں کر پائیں گے تو کیا صورت بنے گی؟ یہ موضوع تفصیلی بحث کا طالب ہے تاہم ہم یہاں صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ تجرباتی طور پر یہ سرمایہ Budgetary Provision کے تحت فراہم کیا جائے۔ جہاں تک قرض کی ادائیگی کا سوال ہے تو Bad Loan ہمارا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس کے حل کی دو صورتیں ہمارے سامنے ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ سرمایہ کے استعمال کی Effective Monitoring ہونی چاہئے۔ جہاں جہاں یہ سسٹم نافذ ہے وہاں لوگوں کی کارکردگی اور پیداواری صلاحیت بھی بڑھی ہے اور قرضوں کی ادائیگی بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ Bad Loan کے واقعات اس صورت میں بہت کم ہوئے ہیں۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ اگر ماہانہ، سہ ماہی، شش ماہی یا سالانہ ادائیگی جو بھی طے ہے وہ نہیں ہوتی ہے تو ان پر جرمانہ لگایا جا سکتا ہے یا ان کی وہ املاک ضبط کر لی جا سکتی ہیں۔ اور اگر اس میں کسی بد دیانتی کا شبہ ہو تو

ایسے لوگوں کے خلاف تعزیری دفعات کا سختی سے نفاذ ہونا چاہئے۔ جہاں اس ملک میں بہت سارے تجربات ہو رہے ہیں وہیں اس طرح کے تجربات بھی کچھ Selective Fields میں کئے جا سکتے ہیں اور تب Comparative Way میں جائزہ لے کر دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ اسکیم کس حد تک مفید، بہتر اور قابل عمل ہے۔

۱۱۔ اوقاف کی تنظیم نو کی ضرورت

مسلمانوں کی معاشی بہتری کی کوئی [illegible] وقت تک نامکمل رہے گی جب تک اوقاف کا ذکر نہ ہو۔ ان تباہ شدہ حالات میں بھی پورے ملک میں مسلمانوں کے پاس اربوں کھربوں کی اوقاف کی املاک ہیں جو حکومت کی عدم توجہی، وقف بورڈ کی نااہلی، ملت کی بے مہری اور مفاد پرست عناصر کی بد دیانتی کے باعث تباہ و برباد ہو رہی ہیں۔ لہٰذا اوقاف کے باب میں ہمیں واضح پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا کام اوقاف کی جائدادوں کا سروے اور ان کے Status Report کی تیاری ہے۔

دوسرا کام سنٹرل وقف ایکٹ مجریہ 1996ء کا نفاذ ہے اور ریاستی وقف بورڈ کی تشکیل نو ہے۔ بعض ریاستوں میں یہ کام ہو چکا ہے اور بعض میں اب بھی باقی ہے۔ تیسرا کام وقف جائداد کی حفاظت اور اس کے بہتر استعمال کو یقینی بنانے کے لئے ایک ایسی کمیٹی کی تشکیل ہے جس میں ملت کے تمام مکتب فکر کے لوگ شامل ہوں۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ خود حکومت وقف جائداد کی سب سے بڑی غاصب ہے۔ لہٰذا حکومت کو اس بات کا پابند کرنا ضروری ہے کہ وقف جائدادوں پر سے اپنا ناجائز قبضہ ہٹا لے۔

چونکہ شہروں میں آبادی بڑھنے کی وجہ سے رہائشی مکانات کا مسئلہ پیدا ہو رہا ہے۔ اس لئے لوگ رہائشی زمینوں کے لئے وقف جائدادوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ قبرستانوں کی زمین پر بھی قبضہ کر کے مکانات بنانے کی مذموم کوشش ہو رہی ہے۔ فرقہ پرست عناصر بھی

وقف جائدادوں پر قبضہ کرنے کے لئے نت نئے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اوراس کے لئے فرضی مندروں کا قیام بڑے پیمانے پر ہورہا ہے۔لہٰذا وقف جائداد کی حفاظت فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے ایک Sensitive مسئلہ بنتا جارہا ہے۔اس لئے اس کی حفاظت کا حتمی انتظام ہونا چاہئے۔جو زمینیں دوردراز علاقوں میں ہیں یا تو ان کو فروخت کرکے ایسی جائداد حاصل کی جائے جن کا انتظام والنصرام آسان ہو یا وقف جائدادوں پر مسلمان کالونیاں بنائی جائیں۔یا پھران کورفاہی کاموں میں استعمال کرنے کی غرض سے دوکان، مکان، Industrial Complex, Market Complex، ہوٹل، مسافرخانہ، اسکول، کالج، Technical Institutions وغیرہ قائم کئے جائیں تاکہ ان کی حفاظت بھی ہوسکے۔ان کا بہتر استعمال بھی ہو اوران سے اچھی آمدنی بھی حاصل کی جاسکے۔اس کے لئے عوامی بے داری مہم چلانے کی ضرورت ہے اورایک ٹھوس منصوبہ بندی کے ساتھ وقف جائداد کی حفاظت اور بہتر انتظام انصرام کا کام کرنا لازمی ہے۔بہار میں وزارت اقلیتی فلاح کو جس کے انڈر میں وقف بورڈ اوراس کی جائدادوں کا انتظام انصرام ہے اسے اس جانب بھرپور توجہ دینی چاہئے۔اس سلسلے میں وزارت اقلیتی فلاح کو ایک Work Shop Seminar کرنا چاہئے جس میں وقف بورڈ سے متعلق ماہرین، قانون داں، سیاسی سماجی کارکنان، مختلف جماعتوں کے مسلم زعماء اور ماہرین معاشیات نیز پلاننگ کمیشن اور اقلیتی کمیشن کے لوگوں کو مدعو کیا جائے اورسب کی رائے سے ایک مشترکہ حکمت عملی طے کی جائے۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ قدم ملت کے معاشی استحکام میں دوررس نتائج کا حامل ہوگا۔

۱۲۔زکوٰۃ کا اجتماعی نظام

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسے ذرائع و وسائل مہیا کئے ہیں کہ اگر فراست کے ساتھ ان کا استعمال ہو تو یہ بہت سارے معاشی مسائل کے حل کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔لیکن افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کا تمام تر اجتماعی نظام اس قدر ٹوٹ پھوٹ گیا ہے کہ اس کی تنظیم نو مشکل ہورہی ہے۔اس کے اثرات نہ صرف سماجی امور پر پڑرہے ہیں، بلکہ خالص مذہبی امور بھی اس سے بُری

طرح متاثر ہیں۔جس کے باعث بہت ساری عبادات کی روح مجروح ہورہی ہے۔اسلام اجتماعیت کا دین ہے۔وہ سفر ہو یا حضر اس بات کو جائز نہیں مانتا کہ مسلمان اجتماعیت سے الگ رہیں۔اسلام کا عباداتی نظام اس اجتماعیت کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔نماز جماعت کے ساتھ فرض ہے۔روزہ خاص اوقات میں خاص مہینہ میں پوری اجتماعی شان کے ساتھ رکھنے کی ہدایت ہے۔حج خالص اجتماعی فریضہ ہے۔اسی طرح زکوٰۃ بھی ایک اجتماعی عبادت ہے۔ان تمام عبادات کی فرضیت تو انفرادی ہے لیکن اس کی بجا آوری اجتماعی طور پر کرنے کا حکم ہے۔لیکن آج یہ ساری اجتماعیت درہم برہم ہوگئی ہے جس کی وجہ سے ان عبادات سے وہ فائدے حاصل نہیں ہو پاتے جس کے لئے ان کو فرض کیا گیا ہے۔

زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے باضابطہ اسلام نے ایک اسٹیٹ ایجنسی بنانے کا حکم دیا ہے۔زکوٰۃ کس پر لگائی جائے گی؟ کتنی لگائی جائے گی؟ کب وصول کی جائے گی؟ اس کی مدات خرچ کیا ہوں گی؟ زکوٰۃ نہیں دینے کی صورت میں کیا تادیبی کاروائی کی جائے گی؟ یہ ساری تفصیلات شارع نے قرآن وسنت میں درج کردی ہیں جن سے یک سرِ مو بھی کوئی انحراف نہیں کرسکتا۔لیکن آج صورتحال یہ ہے کہ ہم نے ان تمام چیزوں کو ایک طرح سے الٹ کر رکھ دیا ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی نیز اس کے جمع وتقسیم کا ہمارے پاس کوئی مرکزی نظام نہیں ہے۔ہر فرد یا ادارہ اپنے طور پر زکوٰۃ کی رقم وصول کرتا ہے اور اپنی صوابدید کے مطابق خرچ کرتا ہے۔

زکوٰۃ کی مد سے حاصل شدہ 80% آمدنی مدارس اسلامیہ پر خرچ ہوتی ہیں جبکہ قرآن میں متعین زکوٰۃ کے آٹھ مدات ہیں۔اس مد پر براہ راست خرچ کرنے کی کوئی ہدایت موجود نہیں ہے۔سورہ توبہ کی آیت نمبر 58 تا 60 میں زکوٰۃ کے جن آٹھ مستحقین کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔① فقراء ② مساکین ③ عاملین ④ مولف القلوب ⑤ الرقاب (غلام) اور قیدی ⑥ مقروض ⑦ فی سبیل اللہ اور ⑧ ابن سبیل (مسافر)

اگر آپ فقراء، مساکین، الغارمین اور ابن سبیل کی شق پر غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ ہماری اجتماعی کفالت اور سماجی تحفظ کی ایک ایسی اسکیم پیش کرتی ہے جس میں ایک شخص کی

واجبی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔ اس کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ وقتی ضرورت کے تحت لوگوں کی امداد کی جائے اور ان کو ان مسائل سے نکالا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایسے تمام افراد کی فہرست بنائی جائے اور ان کی اس انداز اور اس مقدار میں معاونت کی جائے کہ وہ اپنے پیروں پر خود کھڑے ہوسکیں اور زکوٰۃ لینے والے کے بجائے زکوٰۃ دینے والے بن جائیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ زکوٰۃ کے جمع اور وصولیابی کے موجودہ نظام کو بدلا جائے اور اس کی جگہ پر ایسا اجتماعی نظام برپا کیا جائے جو شریعت کے مقاصد کو ٹھیک ڈھنگ سے پورا کرسکے۔ اس کے لئے تمام ریاستوں میں ایک مرکزی زکوٰۃ فنڈ کا قیام عمل میں لایا جانا چاہئے اور ان کے پاس مسلمان بیواؤں، یتیموں، مسکینوں، اپاہجوں، مجبوروں، معذوروں اور ایسے بوڑھوں کی فہرست ہونی چاہئے تاکہ ان کو اس مد سے مستقلاً مدد دی جاسکے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایسے نوجوان جو محض سرمایہ کی عدم فراہمی کی وجہ سے اپنا کوئی چھوٹا موٹا کاروبار نہیں کر پار ہے ہیں یا ایسے کاروباری جو اس قدر مقروض ہوگئے ہیں کہ کسی طرح ان کی بھرپائی نہیں کر پار ہے ہیں یا جن کو اپنے کاروبار کو چلانے کے لئے قرض کی ضرورت ہے ایسی صورت میں ان کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لئے زکوٰۃ کی مد سے قرض اور امداد دونوں دی جاسکتی ہیں۔ یہ امور ملت کی توجہ کے مستحق ہیں جن پر پوری سنجیدگی سے دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں مسلم ماہرین معاشیات اور علماء پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جانی چاہئے جو اس مسئلہ کا ہندوستان کے مخصوص تناظر میں پوری طرح جائزہ لے کر ایک عملی منصوبہ پیش کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی کوشش وقت کی ایسی ضرورت ہے جس سے صرف نظر کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔

۱۴۔ بلاسودی نظام کو رائج کرنے کی ضرورت

اسلام میں سود حرام ہے۔ لیکن طوعاً و کرہاً ہمارے یہاں سودی نظام رائج ہے۔ سود کی ہمہ گیری کچھ ایسی ہے کہ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ سودی لین دین کے بغیر ہمارا کوئی کام نہیں چل سکتا۔ بعض

لوگ اس حد تک جسارت کرتے نظر آتے ہیں گویا اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے جو اس دور میں چلنے والی چیز نہیں ہے۔ سودی نظام کی ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے علماء نے اضطرار کے فتوے دے رکھے ہیں۔ میرے خیال میں یہ نقطۂ نظر نہ صرف غلط ہے بلکہ گناہ ہے۔ اللہ نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا جو نافذ العمل نہیں ہو۔ یہ ہماری کم مائیگی ہے جس کی وجہ سے ہم حالات کے سامنے سپر انداز ہو جاتے ہیں اور فرار کی راہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ دراصل اس باب میں ہمارے ایمان اور تفقہ کا زبردست امتحان ہے۔ ابھی تیس چالیس سال پہلے تک گویا لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ سود کے باب کی آیات و احادیث قرآن کے ان حصوں کی طرح ہیں جو گویا منسوخ ہوگئے ہیں۔ لیکن تحریک اسلامی کے زیر اثر جب مسلم ماہرین معاشیات نے اس سلسلے میں ریسرچ شروع کیا اور اس باب میں تنقیح و تنقید کا نیا سلسلہ شروع ہوا اور متبادل موڈل سامنے لایا گیا تو اب کم از کم اصولی طور پر دنیا نے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ سود کے بغیر معاشی نظام کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔ دوسرے بلاسودی ترقیاتی موڈل، سودی ترقیاتی موڈل کے مقابل نہ صرف یہ کہ قابل نفاذ ہیں بلکہ بہتر ہیں۔ مگر اس سلسلے میں کچھ عملی مسائل ایسے ہیں جب تک ان کا حل سامنے نہیں آتا اس وقت تک اس نظام کو نہ تو ٹھیک ڈھنگ سے نافذ کیا جاسکتا ہے اور نہ اس سے مناسب انداز میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت ملک کے قانونی، معاشی اور بینکنگ نظام میں ایسی اصولی تبدیلی کی ہے تاکہ بلاسودی بینک اور کریڈٹ سوسائٹی کا قیام ممکن ہوسکے۔ نیز ان کو بھرپور قانونی تحفظ فراہم ہوسکے۔ دوسرے ملک کا نظام بلاسودی Institution & Instruments کو تسلیم کرے۔ اس معاملہ میں پہلے تو مسلم رائے عامہ کو پوری طرح ہموار کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر ملک کے ماہرین اقتصادیات کو اُن سے اچھی طرح واقف کرانے اور ان کے اندیشے اور اشکالات نیز عملی دقتوں کا مناسب جواب فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی کچھ ایسے تجربات بھی کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کی روشنی میں لوگوں کو اس کی افادیت اور عملیت کا قائل بنایا جاسکے۔ یہ کام ذمہ دارانہ اور عالمانہ طریقے پر انجام دینا ہوگا۔ اب تک اس جانب ملک

میں جو کوششیں کی گئی ہیں وہ بہت امید افزا نہیں ہیں۔ لہٰذا اس عمل کو اور بہتر انداز سے منظم اور مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں میں تمام تر کمیوں کے باوجود ایک نیا Entrepreneur Class سامنے آرہا ہے۔ ان کی Traditional Industries کو Corporate انداز سے Develop کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کیلئے ان کے درمیان Co-operation اور Co-ordination کی ایک نئی فضا بنانی ہوگی۔ پبلک لمیٹیڈ کمپنی کا ایک کلچر ڈیولپ کرنا ہوگا اور ان سب کو ضروری سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے بلاسودی قرضوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع کرنا ہوگا جو شرکت اور مضاربت کے اصول پر مبنی ہو اور جس میں نفع نقصان میں حصہ داری کے اصول پر تجارتی اور صنعتی معاملات انجام دیئے جاتے ہوں۔ میں یہاں صرف اس سلسلے میں چند اشارات پر ہی اکتفا کر رہا ہوں۔ یہ مسئلہ ملت کی توجہ کا مستحق ہے۔ اس باب میں صرف فتویٰ سے مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے پوری Mechanism ڈیولپ کرنے کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا میں تمام لوگوں سے اس بات کی درخواست کرتا ہوں کہ اس مسئلہ کو پوری سنجیدگی سے لیں اور اب تک کے تجربات کی روشنی میں جو اس سلسلے میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کئے گئے ہیں بلاسودی کریڈٹ سسٹم کا ایسا سلسلہ شروع کیا جائے جو مسلمانوں کی معاشی ترقی کی راہ میں سنگ میل ثابت ہو۔

۱۴۔ خانقاہوں اور مزاروں کی آمدنی کا رفاہی اور ترقیاتی استعمال

ہندوستان بھر میں ہزاروں کی تعداد میں خانقاہوں اور مزاروں کی شکل میں عقیدت و محبت کے مراکز ہیں جہاں لوگ سالانہ کروڑوں روپے تحفے اور نذرانوں کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ یہ انفاق و اعانت کا ایسا سوتا ہے جو کبھی خشک نہیں ہوگا۔ لہٰذا اگر اس سرمایہ کو صحیح طور پر Channelise کیا جائے تو اس سے ملی فلاح و تعمیر کے بہت سے کام انجام پا سکتے ہیں۔

ہمارے ملک میں ایسے بہت سے گرو، مٹھ اور مہنت ہیں ان کے لاکھوں عقیدت مند ہیں اور وہ کافی بڑی بڑی رقمیں فلاحی کاموں کے لئے بطور اعانت دیتے ہیں۔ ان پیسوں سے بڑی بڑی

یونیورسیٹیاں، طبی مراکز، ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور کالج، ہسپتال اور دیگر ادارے قائم کئے گئے ہیں جن سے لاکھوں لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے نہ صرف ان شخصیات کا احترام بڑھتا ہے بلکہ ان کی خدمات سے متاثرین کی ایک بڑی تعداد پیدا ہوتی ہے جو خیر سگالی کا جذبہ پیدا کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔

ایک زمانے میں عیسائی مشنریوں کو اس میدان میں مہارت تامہ حاصل تھی اور آج بھی انہی خدمات کی وجہ سے ان کا خاصا احترام پایا جاتا ہے۔۔ عیسائی مشنریوں نے تعلیم اور صحت کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ قابل تقلید ہیں۔ مدر ٹریسا کو کون نہیں جانتا۔ آج ان کی خدمات سے ایک دنیا متاثر ہے۔۔ ہندوؤں میں ایسی سینکڑوں تنظیمیں ہیں جو رفاہی اور فلاحی کام بہت بڑے پیمانے پر انجام دے رہی ہیں جیسے رام کرشن مشن، آریہ سماج اور دیگر ادارے۔ ہم لوگ آر ایس ایس کو ان کی مسلم دشمنی کی وجہ سے چاہے جتنا غلط سمجھیں لیکن انہوں نے پورے ملک میں رفاہی کاموں کا جال بچھا رکھا ہے۔ اس وجہ سے ہندوؤں میں جو لوگ ان کی آئیڈیولوجی کو صحیح نہیں بھی سمجھتے ہیں وہ بھی ان کی خدمات سے متاثر ہیں۔ غرض خدمت سماجی قبولیت کا بڑا ذریعہ ہے۔

مسلمانوں میں جماعت اسلامی واحد تنظیم رہی ہے جس نے رفاہی اور فلاحی کاموں کا جامع منصوبہ بنا رکھا ہے اور اپنی بساط بھر اس کی کوشش کر رہی ہے۔ ادھر حال کے برسوں میں بہار میں امارت شرعیہ نے اس جانب پیش قدمی کی ہے اور دیگر ادارے بھی سامنے آرہے ہیں جنہوں نے بعض اچھے کام کئے ہیں۔ خاص طور سے اہل حدیث حضرات کی جانب سے کچھ اچھی کوششیں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ بریلوی حضرات نے بھی اس جانب سوچنا شروع کیا ہے اور کہیں کہیں ان کی طرف سے بھی ایسی کوششیں ہو رہی ہیں۔ یہ سب خوش آئند باتیں ہیں۔ شمالی ہندوستان کے مقابلے جنوبی ہندوستان کے مسلمانوں میں زیادہ بیداری آئی ہے۔ اور انہوں نے اس جانب مضبوط پیش قدمی کی ہے۔ جس کے اچھے نتائج سامنے آرہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس روایت کو اور مضبوط اور مستحکم کیا جائے تاکہ اس کے فوائد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پہونچیں۔

کرنا تک میں بعض خانقاہوں نے انجینئرنگ کالج کھول رکھے ہیں۔ اسی طرح اگر دیگر مقامات پر بھی اس طرح کی کوششیں ہوں تو یہ چیز ملی بہتری کی راہ میں مفید ثابت ہوگی۔ بہار میں پٹنہ میں ایک مندر ہے جس میں سالانہ 65 لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ اس پیسہ سے آئندہ دس سال میں دس کڑور کی لاگت سے ایک بڑے کینسر انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا ہے جو اتری پوربی بھارت میں ٹاٹا کینسر انسٹی ٹیوٹ کے بعد سب بڑا ادارہ ہوگا۔

ہمارے یہاں مزاروں اور خانقاہوں میں بھی سالانہ کڑوروں کی آمدنی ہوتی ہے۔ اگر ان پیسوں کو بھی ملی اور انسانی فلاح کے منصوبوں پر خرچ کیا جائے تو یہ ملی وقار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ دکھی انسانیت کی بڑی خدمت ہوگی اور سماجی، معاشی اور دینی نقطۂ نظر سے ایک زبردست چیز ہوگی۔ لہٰذا اہل خانقاہ اور مزارات کے ذمہ داروں کو اس سلسلے میں جامع منصوبہ کے ساتھ آگے آنا چاہئے۔

خانقاہیں ہمیشہ سے دین وانسانیت کی خدمت کا مرکز رہی ہیں۔

لاکھوں نفوس جہاں ایک طرف یہاں سے تزکیۂ نفس کی بیش بہا دولت پاتے رہے ہیں وہیں بلافرق وامتیاز دکھی انسانیت ان سے فیض اٹھاتی رہی ہے۔ ہمارے پاک نفس بزرگوں کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے کیا وارثانِ نفوس قدسیہ اس تجویز پر غور فرمائیں گے؟

۱۵۔ آخری بات

میں نے اس گفتگو میں ان بہت سارے نکات اور معاملات کی طرف اشارہ کیا ہے جو میرے خیال میں مسلمانوں کی معاشی بہتری میں معاون ہو سکتے ہیں۔

میں اس پوری گفتگو کو قرآن کے مندرجہ ذیل رہنما اصولوں پر ختم کرتا ہوں اس لئے کہ اگر ہمارے اندر جب تک یہ جذبات واحساسات پیدا نہیں ہوتے ہم نہ آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ ترقی کر سکتے ہیں۔

اس میں سب سے پہلی چیز Will to Change & Develop ہے۔ قرآن نے صاف صاف اعلان کیا ہے کہ اللہ نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی جب تک خود اس کو اپنی حالت کے بدلنے کا خیال نہ ہو۔

دوسری چیز مایوسی سے بچنا ہے۔ ہر وقت مثبت فکر اور روشن پہلوؤں پر توجہ رکھنی چاہئے۔ حالات تو ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی عروج ہے تو کبھی زوال ہے۔ جس طرح عروج مستقل نہیں ہوتا اسی طرح زوال بھی مستقل نہیں ہے۔ ہر عُسر کے ساتھ قرآن کے بقول یُسر ہے یعنی اگر تنگی ہے تو فراخی بھی ہوگی۔ اگر پت جھڑ کا موسم ہے تو اس کا مطلب ہے کہ موسم بہار بہت دور نہیں ہے۔ اس لئے قرآن کے بقول مایوسی کفر ہے۔ حالات سخت ضرور ہیں لیکن مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لئے مستقبل کی طرف پورے اعتماد اور ہمت کے ساتھ پیش قدمی کرنی چاہئے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ دنیا جائے عمل ہے۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ ہم جس چیز کی کوشش کریں گے وہی ہمیں ملے گی۔ لہٰذا ہر طرح کی کامیابی کے لئے کوشش شرط ہے۔ دنیا سے فرار اسلام کا وطیرہ نہیں ہے بلکہ خدا کا حکم ہے کہ دنیا میں اپنی حصہ داری نہ بھولو۔ تمام جائز اور پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے حلال ہیں۔ لہٰذا قرآن کا فرمان ہے کہ جب تم نماز سے فارغ ہو چکو تو اللہ کا فضل تلاش کرنے کے لئے زمین میں پھیل جاؤ۔ قرآن نے ہمیں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کا طالب بنایا ہے۔ لہٰذا اعتدال کی روش کو قائم رکھتے ہوئے اخروی فلاح کے نقطۂ نظر سے حصول دنیا کی کوشش نہ صرف محمود ہے بلکہ لازمی ہے۔ یہی صحیح اسلامی فکر ہے۔ اگر ہم اس فکر کے حامل ہو جائیں تو ہماری آخرت بھی سنور جائے گی اور دنیا میں ہماری معاشی بہتری کی راہ بھی ہموار ہوگی۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ ہمیں ہر سطح پر Co-operation & Community Co-ordination کو مضبوط کرتے ہوئے متحدہ پیش قدمی کی حکمت عملی اختیار کرنی چاہئے۔ یہی دنیا میں معاشی ترقی اور آخرت میں فلاح کی واحد صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق بخشے۔ آمین۔ □□